ایک چادر میلی سی
راجندر سنگھ بیدی
www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک چادر میلی سی
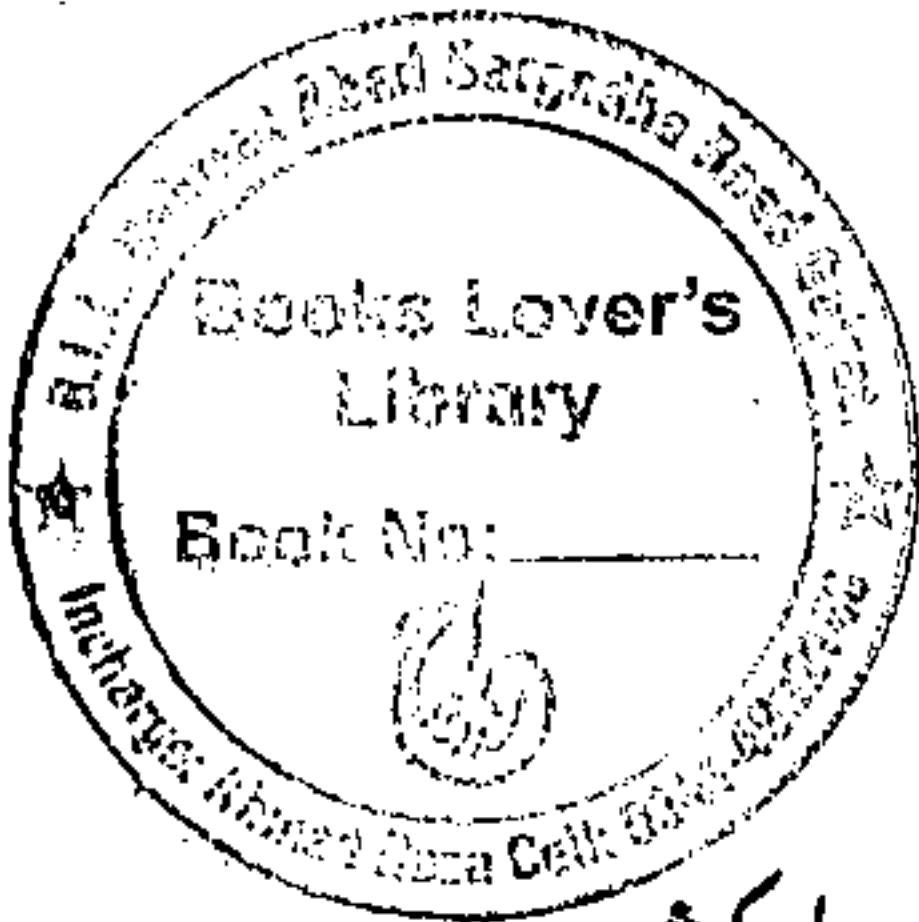
راجندر سنگھ بیدی

سیونتھ سکائی پبلی کیشنز
غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔ اردو بازار، لاہور
فون:37223584، موبائل:0300-4125230

نام کتاب	....	ایک چادر میلی سی
مصنف	....	راجندر سنگھ بیدی
ناشر	....	سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، لاہور
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
سن اشاعت	....	جنوری 2014ء
قیمت	....	=/200 روپے

ملنے کے پتے.........

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

اشرف بک ایجنسی
اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

کتاب گھر
اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

خزینہ علم وادب
الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

ویلکم بک پورٹ
اُردو بازار، کراچی

جہانگیر بکس
بوہڑ گیٹ، ملتان

رشید نیوز ایجنسی
اخبار مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی

کشمیر بک ڈپو
تلہ گنگ روڈ، چکوال

شمع بک ایجنسی
بھوانہ بازار، فیصل آباد

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل وکرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہِ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب

اشک، مجروحؔ، امر اور سریندر کے نام

"اپنا لہو بھی سرخیٔ شام و سحر میں ہے"

مجروحؔ

قصہ کبوتر، کبوتری کا

امر کتھا ختی ہوئی پاربتی او گھ گئی شیو نے دیکھا بھی مگر بھانگ اور دھتورے کی مستی میں اپنی بات کہتے گئے۔ جو گپھا میں اوپر کہیں بیٹھے ہوئے کبوتر اور کبوتری کے جوڑے، پر بودھ اور منیتری نے سن لی اور امر ہو گئے۔

جگ ہی بیت گئے۔ کال کے کانٹے پر بودھ اور منیتری کے لیے کند ہو چکے تھے۔ پر بودھ نے کہا۔ "اب تو وقت ہی اور آ گیا ہے، رانی! اگر تمھیں وہ دن یاد ہے جب آدم کے بیٹے قابیل نے اپنے سگے بھائی ہابیل کو ایک پتھر سے مار ڈالا تھا؟"

"ہاں......" منیتری بولی۔ "ایک بے شکل سی لڑکی کے پیچھے، جوان کی اپنی ہی بہن تھی۔"

پر بودھ جھلا اٹھا...... "تمھیں ابھی تک نہیں معلوم...... مرد اور عورت قدرت کے دو اصول ہیں۔ ان میں ذات اور رشتے کی بات ہی کیا ہے؟"

"ہاں...... مگر......"

"مگر کیا......؟" پر بودھ نے منیتری سے کچھ پرے ہٹتے ہوئے کہا۔ "قدرت کیا اس بات کا حساب رکھتی ہے کہ کس بیج کا جوہر، کن ہواؤں سے، کسی دوسرے بیج پر جا گرتا ہے؟ قدرت کا قانون افزائش نسل ہے چاہے وہ کیسے ہی ہو، کسی سے بھی ہو......"

اس وقت پر بودھ اُن ہزاروں کبوتریوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو بے حد حسین تھیں کیونکہ وہ قاقی تھیں۔ ان کے گلوں کے حلقے زاتوں کے پیازے کالے اور چکیلے ہو رہے تھے۔ اور انڈے روئی کے گالوں ایسے نرم، گورے اور چٹے...... پر بودھ جیسے خیالوں کے اختلاط سے خود ہی تھک گیا اور بولا۔ "عورت کی وجہ سے ہمیشہ لڑائی ہوتی آئی ہے اور ہوتی رہے گی۔"

"عورت ہی کیوں؟" منیتری چمک اُٹھی۔ "زر اور زمین بھی تو ہیں......"

پر بودھ نے شہوانی نظروں سے منیتری کی طرف دیکھا اور بولا۔ "زمین بیدی ہے اور زر اس

سے بڑا............ مگر تم نے کبھی سوچا ہے کہ یہ عورت ہی کے دو روپ ہیں.......... ؟" ۔

میتری نے اپنی نازک سی گردن گھمائی اور اپنی سوچ میں گم ہو گئی۔ پھر پیار کی کنڈیں پربودھ پہ پھینکتی، اپنا دلیاں پر پربودھ کے بائیں پر میں پھنساتی ہوئی بولی۔ "مجھے جھانجریں لا دو نا۔ جو ایجنٹر کے کھنڈر میں ابھی تک لوگوں کی نظروں سے او جھل پڑی ہیں.......... پھر میں تمھیں وہ پیار دوں گی کہ.........."

پربودھ نے جھانجروں کے بارے میں سوچنے سے پہلے ہی گھوں گھوں کرتے، پھولتے ہوئے اپنی چونچ میتری کی چونچ میں اس کے تالو تک کھبو دی اور پھر خود ہی علاحدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "کیا فائدہ اس پیار کا جس میں ہم مر بھی نہ سکیں۔ کسی وقت تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جینا نہیں مرنا امر ہے۔" اور پھر وہ کہہ اٹھا "سب الٹ پلٹ ہو گیا ہے.........."

میتری بھی جانتی تھی کہ پربودھ اس وقت جھانجریں نہ لا کر دے گا۔ جب تک اس کی سوچ میں کوئی خود غرضیاں نہ ہوں گی۔

پھر پربودھ پچھڑی صدیوں کی باتیں کرنے لگا اور ان راسوں کی جو میتریاں نے اسکندریہ میں افرودیتی کے ساتھ سمندر کے کنارے رچائی تھیں۔ پھر ایڈے پس کی جس نے نادانی میں اپنی ماں سے شادی کر لی تھی۔ اور جب اسے پتا چلا تو صدمے ہی سے چل بسا.......... ویر کنال کی باتیں جس کی محبوبہ اس کے باپ کے ساتھ ساجھی ہو گئی تھی اور جس کے کارن کنال کو اپنی آنکھیں دینا پڑیں.......... پھر بھرتری ہری کی جس نے حسن اور جوانی کو دائم قائم رکھنے والا سیب اپنی رانی کو دے دیا۔ مگر رانی نے اپنے عاشق ایک دھوبی کے حوالے کر دیا جس نے اُسے اپنی محبوب طوائف کو دے دیا۔ جو ساری دنیا کا بھلا کرنے کے لیے اسے وقت کے بادشاہ بھرتری ہری کے پاس لے آئی۔

پربودھ اور میتری نے ازل سے سب کچھ دیکھا تھا اور اب ابد دیکھنا چاہتے تھے۔ مرد اور عورت کے درمیان یہ لاقانونیت دیکھ کر میتری بولی۔ "آخر کوئی تو قانون ہونا ہی چاہیے۔" حالانکہ وہ آپی من ست کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جو نیچے پنجاب کے میدانوں میں ایک پرانے ۔ ۔ بڑ پر رہتا تھا اور بے حد جوان اور لاجوردی گردن والا خوبصورت کبوتر تھا.......... اس لیے کہ وہ قانی آتا.......... اور اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میتری کا پورا بدن مہک اٹھا۔ پیٹ میں ایک کسمساہٹ سی دوڑ گئی۔ وہ من ست کی بات کچھ اس انداز سے کرنے لگی جیسے کوئی ' نے تھی نہ تھی۔ مگر اس کا نام سنتے ہی پربودھ پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا

اور اس کے پر پھڑ پھڑانے لگے۔ پربودھ کے غصے اور لرزے کو دیکھ کر مینتری ڈر بھی رہی تھی اور اندر کے کسی جذبے سے خوش بھی ہو رہی تھی۔ نظریں چراتی ہوئی وہ بولی۔ "زندگی کی فلاح کے لیے ہم ہی قانون بناتے ہیں.......... کیا خود انھیں توڑ نہیں سکتے؟"

پربودھ جو کچھ دیر پہلے کہہ رہا تھا.......... "قدرت کا قانون افزائش نسل ہے۔ چاہے وہ کیسے بھی ہو، کسی سے بھی ہو.........." جلدی سے کہہ اٹھا۔

"نہیں.........."

ایک دن کسی لمبی پرواز کے بعد پربودھ اور مینتری اپنے گھونسلے میں لوٹ آئے۔ من ست اُڑتا ہوا امرناتھ کی گپھا تک پیچھے آیا تھا۔ اور پھر مایوس ہو کر واپس ہو لیا۔ مینتری کو اس بات کی خوشی تھی اور افسوس بھی تھا.......... خوشی اس لیے کہ اس کا پربودھ اب بھی اسے آسمانوں سے ہمیشہ نازل ہونے والی بلاؤں سے بچا سکتا تھا اور پھر وہ خود بھی اب تک اتنی خوبصورت اور جوان تھی کہ میدانوں کا من ست فرسنگوں اس کے پیچھے اڑ کر آسکتا تھا اور مایوس ہو کر واپس جا سکتا تھا۔ اور افسوس اس بات کا کہ پربودھ اُسے کسی وقت بھی ایک آزاد پرواز سے روکتا تھا۔

گھونسلے میں پہنچتے ہی پربودھ اور مینتری کو ایک عجیب سی نرمی اور گرمی، سکھ اور آرام کا احساس ہوا۔ جب پربودھ نے اپنی مستی بھری آنکھوں سے مینتری کی طرف دیکھتے ہی اپنے پر اس پر پھیلا دیے اور کہنے لگا۔

"رانی! ہم نے کتنی دنیا دیکھی ہے.......... کتنے جگ.......... کتنے دیش...... پر اس دھرتی پر ایک ایسا دیش ہے جس کی کوئی مثال نہیں۔"

"پنجاب" مینتری نیچے میدانوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ اٹھی۔ اور پھر اس نے ایک سرد آہ بھری جسے پربودھ نے نہ دیکھا۔

"تم نے کیسے بوجھ لیا؟" پربودھ نے ششدر ہو کر پوچھا۔ اور اُس کی لمبی چونچ نے ایک سرخی پکڑ لی۔ مینتری کہنے لگی۔ "وہی تو ایک دیش ہے جس کی دھرتی میں سے آٹھوں پہر لوبان کی خوشبو اٹھتی رہتی ہے، جس کا لمس بدن میں صحت کی خارش پیدا کرتا ہے.........."

"ہاں .... " پر بودھ نے ہامی بھری۔ "اس کے پربت آسمانوں کے ہمسایے ہیں اور دھرتی کی ہری اوڑھنی پہ ویرانی کے رنگ کا ایک بھی چھینٹا تو نہیں۔ اس کے دریا تو ایک طرف، پوکھر بھی انوراگ سے واقف ہیں۔"

"جہاں کے مرد اکھڑ ہیں، عورتیں جھکلو۔ وہ خود ہی اپنے قانون بناتے ہیں اور اگلے ہی پل بے بس ہو کر خود ہی اُنھیں توڑ بھی دیتے ہیں اور پھر نئے قانون وضع کرنے کے لیے چل نکلتے ہیں۔ دیوی ماں سرزد ہونے سے پہلے ہی ان کے گناہوں کو معاف کر دیتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے بہت دکھ دیکھا ہے۔ اُتر پچھم سے ان پر سیکڑوں حملے ہوئے۔ مگر انھوں نے اپنی فولاد سے زیادہ سخت چھاتیوں کو ڈھال بنایا۔ اور آلام کی سب ضربیں ان پہ لے لیں۔ انھوں نے اپنی ماؤں اور بہنوں کی عزت دے دی، پورے دیش کی ماؤں اور بہنوں کی عصمت بچانے کے لیے .... وہ کسی وقت بھی سونے کو مٹی میں رول دیتے ہیں اور پھر اسی مٹی کو کھنگال کر اس میں سے کندن پیدا کر لیتے ہیں .... عجیب کیمیاگر ہیں وہ ...."

"نہ معلوم وہ کس مٹی سے بنے ہیں۔ جمتی ہوئی برفوں اور تپتی ہوئی ریتوں میں وہ بس سکتے ہیں۔ جہاں دنیا کے لوگ دوسروں ہی کی نکتہ چینی میں لگے رہتے ہیں ...."

"وہاں پنجابی ہی ہے جو اپنے آپ پر بھی ہنس سکتا ہے۔ وہ اچھا دوست ہے اور بُرا دشمن .... جہاں بھی لوگ تمھیں ایک بلند آواز سے ہنستے قہقہے لگاتے ہوئے سنائی دیں وہاں ضرور کوئی پنجابی ہوگا کیونکہ وہ دنیا کا ماتم نہیں کرنے آیا اور نہ فلسفہ دانی اس کا نصب العین ہے، وہ جو اندر سے ہے، وہی باہر سے .... اس کے جیون کا رہسیہ ہی یہ ہے کہ کوئی رہسیہ نہیں ...."

"وہ ایک ایسا پودا ہے، رانی! جو دنیا کی کسی بھی دھرتی پہ پنپ سکتا ہے۔ اس کی اپنی دھرتی کی وسعت اس کی نگاہ اور دل میں سما گئی ہے اور ہواؤں کی مستی دماغ میں ...."

"رانی! .... پنجاب اور پنجابی کبھی ناش نہیں ہو سکتے۔ نہ معلوم انھوں نے کون سی امر کتھا سنی ہے جس میں وہ اونگھ بھی گئے نورپا بھی گئے، پی بھی گئے اور چھلکا بھی گئے۔ زندگی کے رونے دھونے سے ان کی سمسیا پوری نہیں ہوتی۔ ہاں .... ہنسنے کھیلنے، کھانے اور پہننے ہی میں ان کا موکش ہے ...."

راجندر سنگھ بیدی

۵ فروری ۱۹۶۲ء

(۱)

آج شام سورج کی ٹکیہ بہت ہی لال تھی...... آج آسمان کے کوٹلے میں کسی بے گناہ کا قتل ہو گیا تھا اور اس کے خون کے چھینٹے نیچے بکائن پر پڑتے ہوئے نیچے تلوکے کے صحن میں ٹپک رہے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی کچی دیوار کے پاس جہاں گھر کے لوگ کوڑا پھینکتے تھے، ڈبو منہ اٹھا اٹھا کر رو رہا تھا۔

دوپہر کے قریب بڑی ذیل کے کارندے جب کتوں کو گولی ڈالنے کے لیے آئے، تو ڈبو بچ گیا۔ وہ تلوکے کے ہاں کہیں صحن میں بڑی گھڑونچی کے نیچے سو رہا تھا۔ اوپر ملتانی مٹی کے گھڑے رس رہے تھے اور نیچے کچی زمین کو ٹھنڈا اور خوش بودار بنا رہے تھے اور ڈبو اس ٹھنڈک اور بوباس سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا...... تھوڑی دیر میں وہ اٹھ کر اکڑا، منہ کھول کر جماہی لی اور پھر باہر چلا آیا۔ جب تک اس کی چہیتی کتیا بوڑی کی آنکھیں کانچ ہو چکی تھیں۔ بوڑی کے پاس پہنچ کر ڈبو نے اسے ایک دو بار سونگھا اور پھر اچانک ایک سمت چل دیا جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ تلوکے کی بیوی رانو اور اس کی پڑوسن چنوں ایک دوسری کا منہ تکنے لگیں۔ چنوں نے اپنی کوکے والی ناک پر انگلی دھری، پھر ایک لمبی سانس بھری اور بولی:

"ہا! مرد کی جات...... سب ایک ہی سی ہوتی ہے......"

رانو کی غلافی آنکھیں پھڑ پھڑا رہی تھیں جیسے کوئی کپڑے کو دھو بنا کر چھانٹ رہا ہو پھر کچھ سنبھلے مگر آنکھیں پونچھتے ہوئے رانو نے چنوں کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی:

"کیوں! تیرا ڈبو تو ایسا نہیں......؟"

اس پر چنتو نے رانو کو ایک مردوں والی گالی دی جس سے وہ خود ہی شرما کر اپنے گھر کی طرف بھاگ گئی۔ رانو بھی اندر پہنچ کر کام کاج میں جا لگی۔ شام کے وقت جب وہ رات کی آہ اور دن کی واہ کا کوڑا پھینکنے کے لیے باہر آئی تو دوپہر کے سارے واقعات بھول چکی تھی جس ہاتھ سے اس نے کوڑا پھینکا، اسی سے جھاڑو چھانٹتے ہوئے وہ منہ اٹھا اٹھا کر رونے والے ڈبو کو بھگانے لگی۔

"ہات!...... ہات مُردے...... یہاں دھرا ہی کیا ہے، تیرے رونے کو؟...... رونا ہی ہے تو جا سامنے چودھریوں کے گھر جا کر رو، جہاں دولت کے ڈھیر ہیں، مردوں کی لام لگی ہے......"

چودھری مہربان داس کے ساتھ رانی کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ شاید اس لیے کہ تلو کے، رانی کے گھر والے، کو بد معاشی کی لت مہربان داس کے ہاتھوں لگی تھی، پھر گانو کی عورتوں کی عجیب بات...... اپنے مرد کا کچھ پتا نہیں، دوسروں کے مردوں کا کھایا پیا سب معلوم۔ رانو اپنے تلو کے کے بارے میں جب ثواب لٹنے والے لیا گوردا س کی بیوی سے سنتی تو جل بھن کر راکھ ہو جاتی۔ شاید راکھ نہیں، کوئلہ۔ کیونکہ اندر سے رانو بہت پکی تھی۔ تلو کا گھر لوٹتا تو وہ اس سے لڑتی، اسے نوچتی کاٹتی اور پھر خود ہی مار کھاتی ہوئی ایک طرف جا بیٹھتی اور سوچتی۔ "ایک طرح سے اچھا ہی ہے جو باہر ہی غصہ نکال آتا ہے اپنا...... میرے جی کا جنجال تو نہیں ہوتا......"

ان، صرف ان باتوں سے رانو کو تلو کے کے مرد ہونے کا پتا چلتا اور وہ ایک ضد کے ساتھ اسے اپنا بنانے کی کوششوں میں لگ جاتی۔ کوششیں کیا؟...... لنڈے پیپل کے نیچے ایک سائیں بابا تھا۔ جتی ستی! جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے لوہے کا لنگوٹ پہن رکھا ہے اور اب تک نہیں جانتا، عورت کیا چیز ہے؟ حالانکہ چوبیس گھنٹے، آٹھوں پہر اس کے گرد عورتوں ہی کا جمگھٹا رہتا...... کوئی بیٹا مانگتی، کوئی اٹھرا کی دوائی...... اکثر

تو اپنے مردوں کو بس میں کرنے کے ٹوٹکے ہی پوچھنے آتیں۔ ابھی کچھ ہی مہینے ہوئے اس نے پورن دئی معرانی کو ٹوٹکا دیا جس سے نہ صرف وہ پیٹ والی ہو گئی بلکہ گیان چند، اس کا مرد، پاگلوں کی طرح اس کے ارد گرد چکر کاٹنے لگا۔ رانو بھی تلوکے کی مار سے بچنے کے لیے باوا ہری داس سے ایک ٹونا لے آئی اور اس تاک میں لگ گئی کب تلوکا کچا دودھ مانگے اور وہ ٹونے کو اس میں گھول کر پلا دے اور پھر پاس نہ آنے دے۔ ہاں، جب منتیں کرے، پانو پڑے ناک رگڑے......... تب......... لیکن ہفتوں تلوکے نے کچا دودھ مانگا نہ پیا۔

تلوکا روز نہیں تو دوسرے تیسرے روز ضرور مٹھے مالٹے کی ایک بوتل چوہدری مہربان داس کے ہاں سے لے آتا تھا۔ رانو دنیا بھر کے عیبوں کو معاف کر سکتی تھی لیکن شراب کو نہیں۔ وہ سمجھتی تھی......... شراب ایسی سوت نہیں دنیا میں۔ مرد چاہے اپنا سب کچھ کسی دوسری پر لٹا آئے پھر بھی اس کا کچھ نہ کچھ تو اپنے لیے بچ ہی رہتا ہے لیکن شراب؟ ماں ری ماں! اس سے تو اتنی بو آتی ہے کہ انسان منہ بھی قریب نہیں کر سکتا۔ یوں معلوم ہونے لگتا ہے جیسے اپنا تو کچھ بھی نہیں رہا۔ سب ہی کچھ لٹ گیا......... تلوکا دن بھر نواب، اسمٰعیل، گورداس وغیرہ کے ساتھ اِکّا ہانکتا لیکن شام کے وقت، نصیبوں والے اڈّے پر پہنچ کر اس تاک میں کھڑا ہو جاتا کہ کوئی بھولی بھٹکی، سواری مل جائے اور وہ اسے اچھے کھانے، نرم اور گرم بستر کے لالچ میں لے جا کر، مہربان داس کی دھرم شالہ میں چھوڑ دے۔ دراصل تلوکا یہ سب مہربان داس اور اس کے بھائی گھنشام ہی کے لیے کرتا تھا لیکن اس پر بھی بدنامی اس کی اپنی ہوتی تھی۔ اس کے حصے میں آتی بھی تھی تو ایک آدھ چانپ اور مٹھے مالٹے کی بوتل.........

کوٹلہ جاترا کی جگہ تھی۔ چوہدری کی حویلی کے بازو میں دیوی کا مندر تھا جو کبھی بھیڑیوں کے چنگل سے بچتی بچاتی، اس گانو میں آ نکلی تھی اور اس جگہ جہاں اب ایک مندر کھڑا تھا، گھڑی دو گھڑی بسرام کیا تھا اور پھر بھاگتی ہوئی جا کر سامنے سیال کوٹ جموں وغیرہ کی

پہاڑیوں میں گم ہو گئی تھی.........اب بھی کسی ڈھلی ہوئی صبح کو کوٹلے سے شمال مغرب کی طرف دیکھا جائے تو دور، اُفق پر کسی ڈاچی کا کوہان سا نظر آتا ہے.........وہی ویشنو دیوی کا پہاڑ ہے۔

تلوکے نے آج جس جاترن کو مہربان داس چوہدری کی دھرم شالہ میں چھوڑا وہ مشکل سے بارہ تیرہ برس کی ہو گی۔ دیوی کے پاس تو اپنے آپ کو بچانے کے لیے ترشول تھا جس سے اس نے بھیروں کا سر کاٹ کے الگ کر دیا لیکن اس معصوم جاترن کے پاس صرف دو پیارے پیارے گلابی سے ہاتھ تھے جنھیں وہ بھیروں کے سامنے جوڑ سکتی تھی، ان سے مدافعت نہ کر سکتی تھی۔ پھر بدن.........جیسے تربوز کے گودے کا بنا ہو جو مہربان کی چھری سے بچ نہ سکتا تھا۔ شاید اسی لیے اس دن کا سورج، غصے میں لال اپنے رتھ کے گھوڑوں کو اِدھر چھانٹا، اُدھر چابک، اُدھر چھانٹا، اِدھر چابک لگاتا ہوا سامنے خانقاہ والے کنویں کے پاس، فارم کی کپاس کے پیچھے کہیں گم ہو گیا تھا اور اوپر آسمان پر، دوج کے نازک سے چاند کو نچڑنے، پیلا ہونے کے لیے چھوڑ گیا.........

دھرم شالے کے پاس ٹھیکے والوں کے مکان کو نئی ٹیپ ہوئی تھی۔ سیاہیوں کے پرے، دیواروں کے چہرے پہ چھپٹ چکے تھے۔ اینٹوں کا گیرو تو دکھائی نہ دیتا تھا، البتہ ان کے بیچ کا چونا، اتنے اندھیرے کے باوجود، سامنے ہنستا، منہ چڑاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پرے وا میں کوٹلے کے سارے پھر دانہہ، جامن اور یکائن سنسنا رہے تھے اور جوہڑ کے کنارے، باوا ہری داس والے لنڈے پیپل کے گنے چنے پتے ایک بے ہنگم سی آواز پر تال دے رہے تھے.........جس راستے پر تلوکا جا رہا تھا وہ گاؤں کے ایک ہی بازار اور بازار میں ایک ہی آٹے والے کی دکان کے سامنے سے ہو کر جاتا تھا جہاں اتفاق کی بات، ایک ہی عورت.........جہلم ارائین اپنی ترکاری دے کر، اس کے بدلے گیہوں لے رہی تھی۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے تلوکے نے آواز دی۔

"کیوں جھلمیں.......... پھر کیا مرضی ہے؟"

گانو بھر میں ایسے آوازوں کی عادی، غریب کی جورو سب کی بھابی، جھلم نے تلوکے کی طرف مڑ کے بھی نہ دیکھا اور جھولی اناج سے بھرتی ہوئی بولی "جو تیری ماں کی ہے، تلوکا! ہائے تجھے پیدا ہونے سے کسی نے نہ روکا؟"

..........اور تلوکا ہنستا ہوا نکل گیا۔

گھر پہنچا تو اس کے جڑواں بیٹے ابھی تک بکائن کے نیچے، کوئلے سے لکیریں ڈال آپس میں بارہ گٹال، کھیل رہے تھے۔ ایک نے غلط ہی دوسرے کی کنکری مارلی اور مہابھارت شروع ہو گئی۔ وہ بنا سمجھے بوجھے بڑوں کی ٹھیٹ زبان میں ایک دوسرے کو گالیاں دینے، بال نوچنے لگے۔ باپ کی آہٹ پاتے ہی وہ ایک دم اپنے اپنے اردو کے قاعدے لیے دیے کی روشنی میں بیٹھ گئے، اُدھر باپ نے آواز دی.......... پڑھوا دے پڑھو" ادھر بڑے بچے نے پڑھنا شروع کیا.......... "وہ دیکھو، الو بولا"

تلوکے نے معاملہ فہمی کے انداز میں کہا "میں سب جانتا ہوں 'حرامیو!" جس پر چھوٹا زور زور سے کہنے لگا "بک بک مت کر، بک بک مت کر" .... اور تلوکا اس نئی تعلیم کو ایک ناقابل علاج بیماری سمجھ کر سٹک گیا۔

ان جڑواں بچوں، بنتے اور سنتے سے بڑی، پہلونٹی کی ایک لڑکی تھی جس کا نام تلوکے اور رانو نے ہمیشہ کی سہولت کے لیے بڑی ہی رکھ دیا تھا۔ وہ دن بھر کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹاتی اور جب کچھ نہ ہو تو سب سے چھوٹے، سال بھر کے جموں کو کھلانے لگتی .... "ویر آیا کھیل کے۔ میں من پکاواں ویل کے" .... وہ محلے کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ گیند بھی کھیلتی جب بھی وہی بھیا اور وہی بھابی۔

"کوٹھے اُتے کنا، ویر میر المساں .... بھابو میری پتلی، جھدے نک مچھلی"

اور ایسی ہی آس پاس کی چیزیں.......... کنا، ویر بھابی، ناک کی مچھلی، لنڈا پیپل، توڑیاں

جیٹھ..........اس کی کائنات ابھی جیٹھ کے تصور تک ہی پھیلی تھی لیکن ابھی سب کچھ مہمل مہمل ہی تھا۔ البتہ گھر میں ایک اور تھا جو تیزی سے سمجھ دار ہو رہا تھا.......... بڑی کا چاچا، تلوکے کا چھوٹا بھائی' رانو کا دیور.......... منگل.......... بے کار اور بدکار.......... دن بھر اسے چھیڑ، اُسے چھیڑ، بار بار اپنے تہہ بند کو کس.......... گھر آتا تو یوں کھانا مانگتا جیسے سب اسی کی کمائی کا ہو اور بھابی رانی اندر سے خوش، باہر سے غصے میں کہتی.......... "دیتی ہوں مشٹنڈے!.......... تیرے ہی لیے تو سب پکا ہے۔"

منگل، پانچ چھے برس کا بچہ تھا جب تلوکا رانو کو بھگا کے، اس کے مائیکے سے لایا۔ رانی کے ماں باپ بے حد مفلس تھے۔ شاید اسی لیے انھوں نے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی اپنی بیٹی کا نام رانی رکھ دیا تھا۔ جب وہ بڑی ہوئی بھری تو روٹی کپڑے کے وعدے پر اس کے ماں باپ نے اس کا ہاتھ تلوکے کے ہاتھ میں دے دیا اور خود عدم آباد کی طرف نکل گئے۔ رانو کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ اس کا آگا تو جیسا تیسا بھی ہے لیکن پیچھا کوئی نہیں۔ کبھی تو ایسا وقت آ جاتا ہے جب ہر عورت گر کر پیچھے دیکھتی ہے اور جو نہ دیکھ سکے تو اسے آگے بھی نظر نہیں آتا...... رانی جب سے کوٹلے میں آئی تھی اسے ماں کے روپ میں ساس جنداں مل گئی اور باپ کی شکل میں سسر حضور سنگھ، اور دیور منگل، جو اتنا چھوٹا تھا کہ بڑی کے پیدا ہونے پر اس کے ساتھ دودھ پینے کے لیے مچل گیا۔ کچھ ہنستی، کچھ شرماتی ہوئی رانو نے اکیلے میں جب اسے پاس بٹھا کر کرتے میں سے چھاتی نکالی اور اس کی طرف بڑھائی تو وہ بھاگ نکلا......

منگل کو رانی ہی نے پالا۔ دنیا کی نظروں میں وہ اس کا دیور تھا لیکن رانی کی نگاہوں میں، اس کا سب سے بڑا بچہ، منگل بھی رانی کو ماں ہی سمجھتا تھا ورنہ وہ سگی ماں کو تائی کیوں کہتا؟ جب تو رانی اس کے کان بھی اینٹھ لیتی تھی، دھول دھپہ بھی کر لیتی لیکن اب پچھلے چند برسوں سے دنیا ہی بدل گئی تھی۔ نہ صرف بچے بڑے ہو گئے بلکہ منگل بھی آنکھیں دکھانے لگا اور کا شراب پینے، اور جنداں روایتی ساس کی شکل اختیار کرتے ہوئے بات بات پر کاٹنے لگی۔ اس

کی اصلی وجہ تو یہ تھی کہ آمدنی کے راستے مسدود ہو گئے تھے .... ادھر تلو کا ہفتے میں تین دن گھر میں ہی پڑا رہتا، اُدھر حضور سنگھ کی آنکھوں میں موتیا بند اتر آیا اور وہ ہمیشہ چارپائی پر بیٹھا کانوں سے دیکھنے کی کوشش کرتا اور اس کی آنکھوں کے پپوٹے صبح جوہڑ میں نہانے والے کبوتروں کی طرح پھڑ پھڑاتے رہتے۔

چھٹی کے دن ایک روز شام کے قریب تلوکے نے رانو کے پاس جا کر اپنے اریب کرتے کی جیب میں سے ایک ٹماٹر نکالا اور اسے رانی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "لے، ایک پیاز ڈال کے کاٹ دے اسے۔"

رانی جو ترکاری پکا رہی تھی، تھم گئی ہاتھ کی کڑچھی دیگچی میں ڈالتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بولی........... "پھر لے آئے میری سوت کو؟"

تلوکے نے جھینپتے ہوئے کہا "روز تھوڑے ہوتا ہے رانو؟"

"روز ہو یا نہ ہو۔" رانی کڑک کر بولی "میں نہ پینے دوں گی۔ کہاں ہے تمھاری بوتل؟ آج میں دیکھ تو لوں، اس میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں۔"

تلوکا اسی بات سے ڈر رہا تھا کہ شور نہ مچے لیکن رانو نے وہی بات کی۔ دانت پیتے اور جھلاتے ہوئے تلوکے نے ایک نامردانہ سی کوشش کی۔ "کتیے کنجریے!........... میں تجھ سے باگ کھینچ کر بات کر رہا ہوں اور تو ہے کہ چھوٹتے ہی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو گئی۔"

"ہاں..........." رانی بولی "بے شک گھوڑے پر تو ہی سوار ہو سکتا ہے دوسرا نہیں...........؟" آج میں اس بات کا فیصلہ کر کے رہوں گی۔ آج اس گھر میں یہ رہے گی یا میں رہوں گی۔"

اور رانو بوتل ڈھونڈنے دوڑی۔ آنا فانا تلوکے کی آنکھ کا پانی مر گیا۔ اس نے بھاگتی ہوئی رانی کو اس کے اُڑتے ہوئے بالوں سے پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں اس کا پٹڑا کر دیا...... دیے کی لو ایک بار بجھنے کے قریب ہوئی اور پھر سیدھی ہو کر کانپنے لگی۔ بکائن پر بیٹھے ہوئے

تلیئر اڑ گئے، ڈبو تن کے کھڑا ہو گیا اور پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھونکنے لگا۔ بڑی چلائی......

"باپو"۔ بچے اندھیرا ڈھونڈنے اور چھپنے لگے۔ ایک تو موقع پاکر گھر سے بھاگ گیا، دوسرا ایک کونے میں جا لگا، دہشت کے عالم میں کانپتا ہوا وہ ماں کے بجائے "آں آں" کہہ رہا تھا۔ حضور سنگھ چارپائی پر سے لپکا، فریاد کے سے انداز میں گالیاں دیتا ہوا۔ "اوئے پاپیا، اوئے بے شرما، اوئے بے حیاوا.........." اور تنور پر گر کر جھلس گیا..........

پہلے ملے میں رانی برابر آئی۔ اس نے اپنی بتیسی تلوکے کے ہاتھ میں گاڑ دی تلوکے نے اور غضب ناک ہو کر، اسے بار بار دیوار کے ساتھ مارا اور وہ گالیاں دیں جو اس نے کبھی اپنے جانور کو بھی نہ دی ہوں گی۔

"مار ڈالا، ماں کو مار ڈالا" بڑی چلا رہی تھی اور جب دادی باہر سے آئی تو بڑی کی شلوار گیلی ہو چکی تھی۔ جنداں آتے ہی بولی.......... "جانتی تھی.......... میں جانتی تھی ایک دن یہ چاند چڑھنے والا ہے.......... ہائے! یہ پڑی[1] داسوں کی اولاد.......... جانے کہاں سے ہمارے گھر میں آ گئی.......... ؟"

تو بیچ میں مت بول۔" منگل ماں سے کہہ اٹھا۔ وہ میاں بیوی کی لڑائی میں کسی کا بھی آنا ٹھیک نہ سمجھتا تھا اور خود ایک طرف کھڑا اپنے آپ کو روکنے اور سمجھانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

"کیوں نہ بولوں؟" بڑھیا بکے جا رہی تھی۔ "اپنی کمائی سے پیتا ہے، اس کے باپ کمینے سے تو مانگنے نہیں جاتا؟" خود تو کھپ گیا، یہ کلنج[2] چھوڑ گیا ہمارے لیے.........."

ماں کی شہ پاکر تلوکا اور بھی تند ہو گیا۔ اس نے رانی کے کپڑے پھاڑ دیے اور اسے یوں کر دیا جیسے ابھی پیدا ہوئی ہو۔ وہ زور زور سے چلا رہا تھا "نکل جا نکل، جا میرے گھر سے۔"

---

[1] خانہ بدوش [2] چڑیل

رانو بے دم سی ہو کر کہے جا رہی تھی "میں نہیں رہوں گی، میں آپی نہیں رہوں گی......" کچی دیوار کے پاس کچھ اجنبی سے چہرے اُٹھے، اوپر کوٹھے پر کچھ عورتوں کے سایے سے رینگے......"مار ڈالا اڑیو مار ڈالا......... ہائے نی کرئی بچاؤ ہائے نی یہ راکھشش......"

ایسی ہی آوازیں آ رہی تھیں سبھی اوپر کلیجا تھامے کھڑی تھیں "نیچے آنے' رانو کو چھڑانے کی ہمت کسی کو نہ پڑتی تھی جب ہی کوٹھے کو ٹھے ہوتی ہوئی جہلم ارائین، اس کی بیٹیاں، پورن دئی برہمنی، نواب کی بیوی عائشہ، چنوں، ودیا، سر وپو سب ہی پہنچ گئیں لیکن ان سب میں صرف چنوں چلا رہی تھی۔ چھڑاؤ وے دے کوئی چھڑاؤ۔"

"کھبر دار جو کسی نے چھڑایا" رانو اوپر دیکھتے ہوئے چلائی "تم سب جاؤ......... جاؤ تم......... کیا تم کو نہیں پڑتیں؟" اور پھر بولی "آج جو ہونا ہے، ہو جانے دو ایک بار...... آج دیوی کے کوٹلے میں بڑا پن ہو گا۔ آج میں اس کے ہاتھوں مروں گی، سورگ کو جاؤں گی......... آج میرے بچے مجھے روئیں گے........."

رانو عورتوں کو بھگا رہی تھی، بلا بھی رہی تھی۔

کہاں تو منگل ایک ضبط کے عالم میں سب کچھ دیکھ رہا تھا اور کہاں اب ایکا ایکی لپک کر اس نے بڑے بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا اور موٹی سی ماں کی ایک گالی دیتے ہوئے بولا "لا .... اب لا ہاتھ نیچے، کہ ایک عورت ہی پر ختم ہو گئی شہ زوری؟......... بل .... بل اب اپنے باپ کا ہے تو؟

تلوکے نے منگل کی آہنی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ کچھ بولنے بکنے لگا لیکن منگل کی نگاہوں میں قتل دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ منگل نے اسی پر بس نہ کی۔ آگے بڑھ کر اس نے زور سے بوتل کو ٹھوکر ماری اور وہ ٹوٹ گئی۔ شراب کی بو لپکی اور منڈیر پر کھڑی عورتیں، چھی چھی کرتی ناک پر کپڑا رکھتی ہوئی پیچھے ہٹ گئیں اور کچھ دیر

کے بعد چلی گئیں۔ پھر تلو کے کو یوں ٹس سے مس ہوتے دیکھ کر منگل نے خود ہی اسے چھوڑ دیا۔ اور وہ........ تلو کا بکتا جھکتا ہوا اندر کوٹھری کی طرف چل دیا۔ اب اس کی گالیوں میں پتھر نہیں، بنولے تھے جو ہولے ہولے دماغوں پر لگ رہے تھے۔ ان میں پہلی سی بے تکلفی نہ تھی۔ اب یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ زبان سے نہیں، کسی کتاب سے کچھ پڑھ کے سنا رہا ہے۔

رانو اندر جا کر ایک ٹرنکی میں کپڑے ڈالنے لگی۔ وہ جا رہی تھی۔ کہاں جا رہی تھی؟ یہ اسے بھی معلوم نہ تھا۔ وہ بس، جا رہی تھی........ بیٹی تو کسی دشمن کے بھی نہ ہو بھگوان ذرا بڑی ہوئی ماں باپ نے سسرال ڈھکیل دیا۔ سسرال والے ناراض ہوئے، مائیکے لڑھکا دیا۔ ہائے یہ کپڑے کی گیند، جب اپنے ہی آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہے تو پھر لڑھکنے جوگی بھی نہیں رہتی........"

کپڑے تھے ہی کتنے؟ پل بھر میں ٹرنکی تیار ہو گئی اور پھر ایک دم رانو کوٹھری سے باہر نکل آئی وہ خود روتی، دوسروں کو رلاتی ہوئی بولی۔ "لو جی سنبھالو اپنا گھر۔ یہاں ایک میں ہی مہمان تھی نا، سو جا رہی ہوں۔ تم لے آنا کسی اور کو جو کرے مرے بھی اور تمہاری گالیاں بھی سنے۔ مار بھی کھائے اور ہڈیاں بھی تڑوائے" پھر رانو کو سامنے بچے نظر آ گئے۔ غم اور غصے میں اندھی ہو کر جنہیں وہ بھول ہی چکی تھی........ "بچے؟"........ وہ خود ہی بول اٹھی۔ "میں سمجھوں گی پیدا ہی نہیں ہوئے۔ سمجھوں گی مر گئے........"

"بڑی نے پاس آ کر دوپٹے کا پلو تھامتے ہوئے کہا........ "ماں!" رانو نے ایک دم جھٹکے سے پلو کو چھڑا لیا اور بولی "پرے ہٹ مردیے! ایک دن تیرا بھی یہی حال ہو گا......"

اور وہ باہر کی بہت ہی وسیع و عریض دنیا کی طرف چل دی۔ اندھیرے کے کارن آسمان کے تاروں کے سوا اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُدھر ایک ایک ستارہ اپنی زمین جتنا بڑا تھا اور کئی زمین سے بھی بڑے........ جو سامنے کھڑے آنکھیں جھپک رہے

تھے۔ بیچ میں کالی بدلی آجانے کی وجہ سے دوج کا چاند دو پھانک ہو چکا تھا..........

منگل نے بھاگتے ہوئے رانو کا بازو تھام لیا اور بولا "بھابی! کہاں جائے گی؟" اور پھر دہشت کے عالم میں پیچھے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "کسے رو کو تائی۔"

جنداں ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی "جائے گی کہاں؟........ آگا نہ پیچھا۔"

حضور سنگھ چلایا 'دھیے! آرلیے" اور پھر اندازے ہی سے اس کی طرف لپکتے ہوئے پاس پہنچتے ہوئے اپنی پیٹھ پر سے کرتا اٹھالیا اور وہ چھالے جو تنور پر گر کر جھلس جانے کی وجہ سے پڑ گئے تھے دکھاتے ہوئے بولا۔ "میرا اپنڈا تو دیکھ بیٹا۔"

رانو اُبل پڑی۔ منہ پر دوپٹہ لیتے ہوئے بولی۔ "باپو! جب تک تلو کے کا نشہ بھی ہرن ہو گیا تھا۔ ایک یتیم لاوارث کی طرح وہ اندر سے آکر دروازے میں کھڑا ہو گیا اور اکھڑی سی آواز میں بولا "جا........ جانہ، دیکھتا ہوں کہاں جاتی ہے؟"

"کہیں بھی جاؤں، تجھے اس سے کیا؟" رانی روتے ہوئے بولی 'جہاں بھی جاؤں گی محنت مجوری کرلوں گی، اپنا پیٹ بھرلوں گی.......... دوروٹیوں کے لیے مہنگی نہیں کسی کو گانو بھر میں کوئی جگہ نہیں میرے لیے، دھرمشالہ تو ہے.........."

دھرمشالہ "تلوکا چونک اٹھا.......... ایک دم آگے بڑھتے ہوئے اس نے رانی کی ٹرنکی پکڑلی اور بولا "چل......... مڑ پیچھے۔"

پیچھے؟......... آگے؟......... رانو، خوددار رانو بہت کچھ چھینی جھپٹی لیکن تلوکے کی طرح باتوں اب میں بھی کوئی دم نہ رہ گیا تھا۔ وہ کوئی بہانہ ہی چاہتی تھی جس سے وہ بھی رہ جائے اور عزت بھی.......... اور اب جانے کا فائدہ بھی کیا تھا؟.......... بوتل تو ٹوٹ ہی چکی تھی۔

(۲)

حضور سنگھ کے جلتے ہوئے بدن پر رال لگا کر رانو لوٹ آئی۔ تلوکا ٹانگیں پھیلائے پڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ سونے سے پہلے منا ایک بار رویا لیکن ماں کی چھاتی منہ میں دینے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ تلوکے کے دماغ میں آج کے ہنگامے کی بجائے وہ جاترن گھسی ہوئی تھی اور رات بھر گھسی رہی۔ اندھیرے میں وہ خود مہربان داس تھا اور رانو جاترن۔ تلوکے نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو رانو نے جھٹک دیا۔

"ہی بچی!......... بالکل بچی!" تلوکے نے کچھ کھسیانہ ہو کر کہا "تو تو بالکل ایک بارہ تیرہ برس کی بچی کی طرح کرتی ہے۔ ویسے ہی دولتی جھاڑنے لگتی ہے.........."

پھر تلوکا منت سماجت پر اتر آیا۔ وہ بھی ان مردوں میں سے تھا اندھیرا ہوتے ہی جن کی ساری اکڑ جاتی رہتی ہے۔ پھر اس نے اٹھ کر شیوجی کی تصویر نکالی جس میں وہ پاروتی کو پاس بٹھائے ہوئے تھے اور سر کی جٹاؤں میں سے گنگا بہہ رہی تھی۔ رانو کے پاس تصویر رکھ کر تلوکے نے شیووں کا واسطہ دیا۔ پاروتی کے امر پیار کی باتیں کیں لیکن رانو اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ پھر اس نے رادھے کرشن کی تصویر چوکھٹے میں سے نکال لی.......... وہ چوکھٹے سمیت بھی لا سکتا تھا لیکن وہ ہر تصویر کو چوکھٹے میں سے نکالے دے رہا تھا، جیسے وہ پیے ہوئے ہو یا ایسے ہی اس کے دماغ میں کوئی فاسد مادہ اڑ گیا ہو۔ کچھ دیر بعد چوکھٹے ہی چوکھٹے رہ گئے۔ تصویریں بیچ سے غائب ہو گئیں۔

رانو صبح اٹھی تو اس کا عضو عضو درد کر رہا تھا۔ وہ اٹھنا نہ چاہتی تھی لیکن گھر کا سارا

کام کاج پڑا تھا۔ شام کو کسی نے کچھ نہ کھایا تھا، اس لیے روٹی کی بھی جلدی تھی، پھر گھوڑے کے لیے دانہ بھگونا، اس کا ساز نکالنا تھا۔ تلوکا ہمیشہ کی طرح اوہ موا پڑا تھا۔ آنکھیں بھی آدھی کھلی، آدھی بند، منہ پورا کھلا ہوا............ رانو اس کے پاس سے اٹھ کر دیے کے پاس گئی اور اسے ہاتھ میں لیے پھر تلو کے پاس چلی آئی............ اسی جذبے سے جس سے انسان مرے ہوئے سانپ کو دیکھنے کے لیے لوٹ آتا ہے۔

جب تلوکا اٹھا تو رانو گھر کا آدھا کام کر چکی تھی۔ اسے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کل شام کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کے ہاتھوں سے ساز لیتے ہوئے تلو کے ماتھے پر پھر سے تیوری چڑھ گئی۔ اسے دیکھنے پر بھی یہی معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ رات اس نے معافیاں مانگی تھیں، نہ کان پکڑے تھے اور نہ ناک سے زمین پر لکیریں کھینچی تھیں۔ یوں بھی سورج کی کرنوں کے ساتھ ہی اس کی مردانہ اکڑ لوٹ آئی تھی۔ ساز کے تھامتے ہی اس کے گھنگرو چھن چھن کر اٹھے۔ گھوڑی کی پروں والی کلغی میں ہوا کی ایک لہر دوڑ گئی اور تلو کا بولا "یہ نہ سمجھنا میں تجھ سے ڈر گیا ہوں۔"

"میں کب کہتی ہوں؟" رانو نے ٹالتے ہوئے کہا۔

تلوکا اس پر بھی چپ نہ ہوا............ "عورتوں سے وہ ڈرتے ہیں جو نامرد ہوتے ہیں............ آج میں پھر لاؤں گا مٹھے مالٹے کی بوتل، دیکھوں گا تو کیسے روکتی ہے؟"

رانی کچھ نہ بولی............ البتہ دل ہی دل میں اس نے سوچا۔ آج یہ لایا مٹھے مالٹے کی بوتل، تو میں گلے کی ہولدلی چبالوں گی۔ بارہ سنگھے کا پورا سینگ پیٹ میں گھونپ لوں گی۔ کتے کی گولی کھا مروں گی جو اس دن بوڑی نے کھائی تھی۔ پھر یہ کمینہ بھی ڈبو کی طرح ایک نظر مجھے دیکھ کے چھوڑ دے گا؟ ایک آدھ دہاڑ تو مارے گا ہی۔ میرے لیے نہیں تو اپنے بچوں کی خاطر............ نہیں نہیں............ کسی کا کیا جائے گا؟............ مرجائے گی ماں باپ کی بیٹی پر ان بلب کہاں ہیں؟............ آگانہ پیچھا............ میں نہیں مروں گی۔ سا ہی

خوش ہو گی، کہے گی............ ستے ہی میں جان چھوٹی.........

جب ہی منگل اپنے البیلے پن میں پاس سے گزر گیا۔ بھائی کے پاس پہنچا تو دونوں مغائرت کی نظر سے ایک دوسرے کو دیکھنے، غرانے لگے۔

"تیار ہو گیا ہے پٹھا" تلوکے نے کہا اور خود ہی دم دبا کر اندر بھاگ گیا۔

منگل نے کوئی جواب نہ دیا اور باہر نکل گیا۔ بڑی ماں باپ کو ایک دوسرے کے قریب آتے دیکھ کر صحن کی طرف سٹک گئی اور چھوٹے بھائیوں کو مدرسے کے لیے تیار کرنے لگی۔ دوسری کوٹھری میں رات بھر کراہتا، جاگتا ہوا حضور سنگھ کہیں پچھلے پہر سو گیا تھا۔ جنداں دبی زبان میں جپ۔جی کا پاٹھ کر رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد اکا سواریوں سمیت گھر کے سامنے کھڑا تھا اور رانو ہمیشہ کی طرح چار موٹی موٹی روٹیاں ایک میلے، روغن میں بسے ہوئے کپڑے میں لپیٹ کر تلوکے کو دے رہی تھی۔ رانو نے ایک نظر اِکے کی طرف دیکھا جہاں بارہ تیرہ برس کی ایک لڑکی کچھ ہوش اور کچھ بے ہوشی کے عالم میں بیٹھی تھی اور چودھری مہربان داس کے کامے[1] اسے تھامے ہوئے تھے اور شہر لے جا رہے تھے۔ رانو نے حیرانی سے پوچھا............ "کون ہے............ کیا ہوا اسے؟"

مر گی!" تلوکے نے جواب دیا۔ وہ گھوڑے کی پٹی کا بکلس لگا رہا تھا۔

رانو نے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "مرگی؟"

"ہاں!" تلوکا بولا "مرگی............ جو ہر عورت کو پڑتی ہے............ رات تجھے بھی تو پڑی تھی............ اور جس کا علاج جوتا ہے" اور پھر اندر طاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یا وہ چھانٹا جو میں آج نوٹ کر تجھ پر توڑوں گا۔ کل ہی تمھو نے اس پر شام[2] چڑھائی ہے۔"

---

[1] کارندے [2] لوہے کی موٹھ

رانو کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ تلو کے کے جاتے، نظروں سے غائب ہوتے ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ چھانٹے کو طاق پر سے اٹھا کر اندر بھنڈارے میں لے گئی اور اسے بھڑولی میں گیہوں کے نیچے، بہت نیچے کر کے چھپا دیا۔

ابھی دوپہر بھی نہیں ہو پائی تھی کہ سامنے، شاملات کی طرف سے کچھ آدمی دوڑتے ہوئے آئے جن میں نواب اور اسمٰعیل، اِکّے والے بھی تھے۔ گیان چند.......... پورن دئی کے شوہر اور دیوانا، چکی کے مالک کے پاس پہنچتے ہوئے نواب نے کہا "اوئے پنڈتا سنا تو نے؟".......... اور پھر اپنا منہ پنڈت کے کان کے پاس کر کے کچھ کہا اور پھر سب مل کر چہ میگوئیاں کرنے، تلو کے کے گھر کی طرف دیکھنے لگے.......... جب ہی جہلم کا دلعاد مراد بخش دکان پر سے ایک ہاتھ میں ترازو اور دوسرے میں دو سیری پکڑے ہوئے آیا اور شاہی.......... جاٹ کو خانقاہ والے کنویں پر جانے سے روکنے لگا۔ پھر اس نے شاہی کے قریب ہوتے ہوئے کچھ کہا اور آخر وہ بھی دوسروں کے ساتھ مل کر تلو کے کے گھر کی طرف دیکھنے لگے.......... رانو دروازے میں کھڑی ان سب کے دیکھنے کو دیکھنے لگی..........

چنوں جو رانو سے رات کی صلح کے بارے میں پوچھنے آئی تھی اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ "بتا بتا پھر کیا ہوا؟"

رانو نے اس کی توجہ سامنے ہونے والی سرگوشیوں کی طرف دلائی اور بولی "ہائے نی.......... آج ان مردوں کو ہوا کیا ہے؟.......... سب کے سب اسی طرف دیکھ رہے ہیں.........."

"ہاں!" چنوں نے دیکھتے ہوئے کہا "جانتی ہے کیوں؟"

"کیوں؟"

"رات مار کھا کے ہڈیاں تڑا کے تو اور بھی نکھر گئی نا"

"رنڈیے.......... کھسم کھانیے" رانی چنوں کو چوٹی سے پکڑتے، کھینچتے ہوئے کہا اور

پھر دونوں ایک دوسرے کے کولھوں میں چپے دینے کلکاریاں مارنے لگیں۔

رانو کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس نے چودھری مہربان داس، اس کے بھائی گھنشام کو ہتھکڑیاں لگے بازار میں سے گزرتے ہوئے دیکھا لیکن .... ساتھ اٹھارہ انیس برس کا ایک نوجوان لڑکا بھی تھا جس کے کپڑے خون سے تربتر تھے۔ اس کے منہ، سر، ہر جگہ پر خون ہی خون دکھائی دے رہا تھا اور وہ کچھ ہوش، کچھ بے ہوشی کے عالم میں حوالدار جہان خان اور نمبردار تارا سنگھ کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔ مہربان داس کا رنگ ایک دم سیاہ ہو جانے سے اس کے کانوں میں بڑی نینساں چمکنے لگی تھیں۔ گھنشام کے ماتھے پر بڑے بڑے نیل دکھائی دے رہے تھے اور صافہ یوں گلے میں پڑا تھا جیسے اسے باندھنے کی فرصت ہی نہ ملی ہو اور یا پھر لڑائی جھگڑے میں کھل گیا ہو۔

"شکر ہے۔" رانو بولی "میں تو آج گڑ بانٹوں گی چنی .... ہر کسی کے بننے کی بجائے یہ آج سرکار کے جنوائی بنے ہیں۔"

چنوں نے کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ رانو نے ناچتے اور تالیاں بجاتے ہوئے کہا "میں تو آج ناچوں گی گدھا[1] ڈالوں گی ...." اور پھر دروازے ہی میں سے مندر کے کلس کی طرف دیکھتے اس کی طرف ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ بول اٹھی ....

"شکر ہے دیوی ماں .... آج تو نے سن لی میری .... آج کا دن تو دھنیہ ہو گیا میرے لیے ...."

جب ہی تلو کے کا اکا دکھائی دیا لیکن اسے گوردا اس چلا رہا تھا .... "ہائے نی!" رانو نے چنوں سے کہا اور پھر اسی طرف دیکھنے لگی۔

اِکے کے اندر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ رانو نے سوچا .... شاید اس مرگی والی لڑکی کو کچھ ہو گیا؟ پھر سب سواریاں مل کر اس لڑکی کو اتارنے لگیں۔ جب اسے پاس لائے اس کے منہ

---

[1] پنجابی عورتوں کا ناچ جس میں تالی کو بہت دخل ہوتا ہے۔

سے کپڑا ہٹایا گیا تو رانو ایک دم چلائی............ "نہیں"............ اور پھر اندر کی طرف بھاگ گئی اور چنوں سر اور چھاتی پیٹتے ہوئے اپنے گھر کی طرف۔

تلوکا قتل ہو گیا تھا!........... خانقاہ والے چاہ کے قریب اس نوجوان جاترن کے بڑے بھائی نے اسے پکڑ لیا تھا اور اس کی شہ رگ میں دانت گاڑ دیے...... اور اس وقت چھوڑا جب اس کے بدن میں خون کا ایک بھی نمکین قطرہ نہ رہا............

جس وقت لوگوں نے اسے پکڑا وہ نوجوان وحشت کے عالم میں آنکھیں پھیلائے دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھائے مندر کے کلس کی طرف دیکھتا ہوا ایک مذہبی غیظ و غضب، ایک جنون کے عالم میں چلا رہا تھا........... "تیرے نمت............ ہے دیوی ماں! تیرے نمت........ "اور ہو لوگ اسے مارتے دھاڑتے ہوئے لے جا رہے تھے، اور وہ ایک بلند آواز میں دیوی ماں کی بھینٹیں گا رہا تھا۔

ماتا رانی دے دربار جو تاں جگدیاں
میا رانی دے دربار جو تاں جگدیاں

ماتا رانی کے دربار میں جوتیں جل رہی ہیں امیا رانی کے دربار میں جوتیں جل رہی ہیں............ اور ان جوتوں کی چمک اس کی پھیلتی کانچ ہوتی ہوئی آنکھوں میں چلی آتی تھی۔ بیچ میں اس کا رنگ ایکا ایکی پیلا پڑ جاتا اور پھر ایک دم لال، کیسری ہو اٹھتا۔ جب ہی ہر لحظہ بڑھتے ہوئے لوگوں کے ہجوم کے ساتھ وہ مندر کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے کود کود کے اُچھل اُچھل کے، لپک لپک کے گانا شروع کر دیا۔

ہے میا! تسیں ستے بھیناں گوریاں
سر لال پھلاں دیاں جوڑیاں
میا رانی دے دربار...... جو تاں جگدیاں

اے میا! تم ساتوں بہنیں گوری ہو۔ تمھارے سر پر لال پھولوں کی جوڑی ہے

..........اور وہ اپنے خون میں بسے ہوئے کپڑوں کو نچوڑ نچوڑ کو لہو اپنے سر پر مل رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دیوی کی روح اس میں چلی آئی ہے اور ایک انتقامی جذبے سے اپنا روپ کرروپ اور آنکھیں آگ ببھوکا کیے، بھیروں یا تلوکے کی طرف دیکھ رہی ہے......

پھر وہ ڈنڈوت کے انداز میں مندر کے دروازے پر لیٹ گیا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا......

لوگ ڈرسے کانپتے ہوئے اسے چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ وہ چاہتا تو اسی جنون کے عالم میں چلاتا بھینٹیں گاتا ہوا کہیں بھی نکل جاتا لیکن کچھ دیر بعد اس نے خود ہی اپنے آپ کو نمبردار تارا سنگھ کے حوالے کر دیا.......... یہ بھی اس کے جنون ہی کا ایک حصہ تھا۔

آس پاس کے پندرہ بیس گاؤں سناٹے میں آ گئے۔ کوٹلے بھر میں کہرام مچ گیا۔ بے موسمے بادلوں نے سورج کی آب و تاب کم کر دی اور وقت سے بہت پہلے اندھیرا چھا گیا ویشنو دیوی مندر کے کلس تلوکے کے گھر میں جھانکنے لگے۔ بکائن نے پتیاں سمیٹ لیں اور ڈبو نے رونے بھونکنے کی بجائے اپنی دُم ٹانگوں میں سکیڑ لی۔

حضور سنگھ کی آنکھوں میں پرماتما نے ایکا ایکی روشنی دے دی.......... بیٹے کی لاش دیکھنے کے لیے!.......... جنداں غش کھا کر دس بارہ گھنٹے کے لیے بچوں کی چچلاہٹ سے گزر گئی۔ رانو باہر دوڑی، پھر اندر چلی آئی پھر باہر اٹھ دوڑی.......... اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں اسے گھر کے سب زیور، سب کپڑے پہننے کا خیال چلا آیا۔ وہ نیہ غضب کرنے والی تھی کہ چنوں نے پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ دیوار سے مار مار کر چوڑیاں توڑنے لگی۔ پورن دئی باہر سے مٹی کی مٹھیاں بھر کر لائی اور رانو کے سر پر خالی کر دیں لیکن رانی اب تک کچھ نہ سمجھی۔ وہ پھر اندر لپکی اور بھنڈارے میں جا کر گیہوں کے ڈھیر میں یوں ہاتھ مارنے لگی جیسے حاملہ کتیا چونہہ چونہہ کرتی ہوئی پنجوں سے زمین کے پڑے تک کھود ڈالتی ہے.......... رانی نے وہی شام لگا چھانٹا نکال لیا اور اسے لے کر باہر سب کے سامنے چلی آئی اور کسی اندھے جوش سے اسے تلوکے کو دکھاتے ہوئے توڑ دیا اور بولی.......

"لے میں نے توڑ دیا تیرا چھانٹا.......... بڑا مجھ پر توڑنے آیا تھا.........."

سب سمجھے رانی پاگل ہو گئی ہے۔ رانی پاگل ہو گئی تھی اور نہیں بھی۔ بڑی دیوار کے ساتھ کھڑی پہلے ہی چیخ پکار کر رہی تھی۔ اس پر رانو نے اس کے پاس جا کر سر پر ایک دو ہتڑ جڑ دیا اور بولی "سب پہ گڑے اپڑتے ہیں، سب کو سیتلا نکلتی ہے، سب مرتی ہیں، ایک تو نہیں مرتی.........." وڈیا نے بیچ میں آ کر بڑی کو چھڑا لیا.......... اس غریب کا کیا قصور تھا؟ قصور کیوں نہیں؟ کیوں وہ ایسے باپ کے گھر پیدا ہوئی تھی جو اس کا رہن چھڑائے بغیر ہی چلتا بنا.......... پھر چوکھٹ پر کھڑی رانو کو ایک پل کے لیے خیال آیا.........."رودے رودے کشتیے؟ نہیں تو جمانہ تجھ پر ہنسے گا.......... ہنسے گا!" لیکن رونا تھا جو کسی طور نہیں آ رہا تھا۔ ایکا ایکی رانو کو اپنے بچے کسی کے بچے معلوم ہونے لگے۔ اپنا گھر، کسی کا گھر...... وہ پھر اندر گئی تاکہ پیاز ہی کوٹ کر اس کا پانی آنکھوں میں ڈال لے اور رودے.......... رودے.......... آخر اس کی ضرورت نہ پڑی.......... سامنے رکابی میں وہ ٹماٹر پڑا تھا جو تلوکا رات مٹھے مالٹے کے ساتھ کھانے کے لیے لایا تھا۔

اب رانی کے بندھ ٹوٹے۔ وہ رو رہی تھی، بین کر رہی تھی۔.......... اور سر پر دو ہتڑ مار رہی تھی اور گانو بھر کی عورتیں زار زار روتی ہوئی اسے روک رہی تھیں...... رانی کے بینوں نے ساتوں آسمانوں میں چھید کر دیے، منگل چلا اٹھا.......... "ماں!" اور پھر دیواروں کے ساتھ اپنا سر پھوڑنے لگا۔ رانی چلا رہی تھی.......... "رانی بندیے! تیرا چھانٹا آگا.......... ہائے رنڈیے! تیری شکل تو اب باجار بیٹھنے والی بھی نہیں، اب تو تو پیشہ کرنے جوگی بھی نہیں.........."

ٹھوڑے

(۴)

چودھری مہربان داس، اس کے بھائی گھنشام اور باواہری داس.......... سب کو سات سات سال کی قید سخت کی سزا ہو گئی تھی۔ ساتھ جاترن کے بڑے بھائی اس کے لڑکے کو بھی اتنی ہی، کیوں کہ لوگ مقتول کی لاش کو نمبر دار تارا سنگھ اور حوالدار جہان خان کے پہنچنے سے پہلے، موقع پر سے لے جا چکے تھے، اور وکیل صفائی قاتل کے سلسلے میں ناگہانی اشتعال ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن.......... باواہری داس کو اتنی لمبی سزا کیوں.......... ؟ اسے اس لیے کہ اس کا لوہے کا لنگوٹ بوسیدہ سے کپڑے کا نکل آیا تھا۔

باواہری داس کو ایسی عبرتناک سزا سن کر، کوٹلے کی سب عورتیں چپ ایک دوسری کے منہ پر کچھ ڈھونڈنے لگیں۔ پکڑی گئی تو پورن دئی برہمنی، جو سب سے زیادہ باتیں کرنے کی عادی تھی اور جس کے منہ سے ایکا ایکی ہا نکل آئی تھی اور آنکھوں سے آنسو.......... لوگ کہتے تھے جب تک گانو پر مندر کی چھتر چھایا ہے اور دیا دھرم والے لوگ جوہڑ کے کنارے آکر آبیٹھنے والے کبوتروں کو دانہ دنکا ڈالتے ہیں کوٹلے میں کوئی پاپ نہیں ہو سکتا۔ ہو گا بھی تو اس کی پوری سزا سے ملے گی جیسی کہ بھیروں کو ملی تھی۔

چودھریوں کی حویلی، جائیداد زمین وغیرہ سب مقدمے میں گئے۔ دھرم شالہ پنچایت کے عمل میں چلی آئی۔ اس سانحے کے بعد لوگ اتنے چوکنے ہو گئے کہ ان میں سے کسی کی بھی ہمت عورت کو سامنے سے دیکھنے کی نہ پڑتی تھی البتہ گانو کی کنج گامنیاں جب اپنی مستی میں نکل جاتیں تو سب انھیں پیچھے کی طرف سے جاتے ہوئے دیکھتے اور نظروں سے

ان کے اٹھتے گرتے کولھوں کے ساتھ تال دیتے اور کچھ دیر میں تال تک دینے کی ہمت نہ رہتی۔

حضور سنگھ کی ہڈیوں تک میں پانی پڑ گیا تھا۔ وہ چارپائی پر بیٹھا، بڑھیا کی گالیاں سنا کرتا۔ جنداں اسے ایک دن رو بیٹھنے کی منتظر تھی۔ کوئی زمانہ تھا جب حضور سنگھ نے اس عورت کو راج کرایا تھا۔ بڑے بڑے شہروں کے چڑیا گھر اور تو تا محل دکھائے تھے لیکن اب وہ بے کار، بے یار و مددگار، گھر میں پڑا گرنتھ صاحب کے نویں محل کے شبد گنگنایا کرتا جو دنیا کی بے ثباتی کی تفسیر میں لکھے گئے تھے اور حضور سنگھ کو ایک عجیب طرح کا حوصلہ اور ہمت دیتے تھے۔ جنداں رات دن کے چوبیں گھنٹے چپکا کرتی۔ رانی کو تو دیکھتے ہی بڑھیا کے بدن کے سارے تکلے کھڑے ہو جاتے اور وہ رانی پر اپنی گالیوں کے چھاجوں کے چھاج خالی کر دیتی........ رنڈیے! ڈائنے! چڑیلے!.......... میرے بیٹے کو کھا گئی اور اب ہم سب کو کھانے کے لیے منہ پھاڑے ہوئے ہے؟.......... چلی جا.......... جدھر منہ کرتا ہے کر لے اب اس گھر میں کوئی جگہ نہیں تیرے لیے۔" رانو ایک پل کے لیے بھی وہاں نہ رہتی لیکن ....پاپی من، جو ایک جالے کی طرح بچوں کے ساتھ لپٹا ہوا تھا، اسے کچھ بھی نہ کرنے دیتا۔ جتنا جنداں اسے گھر سے نکالنے کی کوشش کرتی اتنا ہی رانو اس کے پانو پکڑتی۔ زندگی میں یوں ایکا ایکی بے قیمت ہو جانے سے ...زی سے ڈھلنے لگی۔ جو چیزیں اس کے بدن میں کم ہو رہی تھیں وہی بڑی کے جسم میں بڑھنے لگیں۔ وہ پر پھل.......... جنگل کے پھول کی طرح اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، سب طرف بے تحاشا کھلنے لگی۔ کبھی اس پھول کی ایک پتی گر بھی جاتی تو اس کی جگہ دو اور نکل آتیں۔ اپنے آپ سے بے خبر وہ اچھلتی کودتی، چاندنی رات میں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے نکل آتی۔ دیر سے گھر لوٹنے پر دھان کی طرح پھٹک دی جاتی لیکن اس پر جیسے کوئی اثر ہی نہ ہوتا۔ کچھ غریبی کی وجہ سے اور کچھ جان بوجھ کر رانو اسے پھٹے پرانے، تیل اور بساند میں رسے بسے ہوئے کپڑوں میں رکھتی۔ بال بنانے کی بجائے

بکھیر دیتی تاکہ اس پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ بڑی گوری چٹی تھی اور یوروکے الفاظ میں اس پہ کسی "رنگیج"[1] کی اولاد ہونے کا شبہ پڑتا تھا۔ جب کوئی میلی نظر سے بڑی کی طرف دیکھتا تو رانو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتی اور پھر سب باتوں سے نپٹ کر پکار اٹھتی۔

گورا رنگ نہ دئیں دے ربا

سارا پنڈ ویر پے گیا

گورا رنگ نہ دیجو پرماتما! سارا گانو بیری ہو گیا........... رانو جتنا بڑی کو چھپانے کی کوشش کرتی اتنا ہی اس کا جوبن ان میلے اور بوسیدہ کپڑوں میں سے پھٹ کر سامنے چلا آتا۔ وہ اس معصوم اور متحیر بچے کی طرح تھا جو باجے کی آواز سنتے ہی بے اختیار کھڑکی میں آکھڑا ہوتا ہے۔ بڑی کو یوں انجان اور بے خود دیکھ کر رانو سر ہلا دیتی اور کہہ اٹھتی........... اس بے باپ کی بیٹی کا انت بُرا ہے جس دن کسی دشمن کی اس پر نظر پڑ گئی یہ کہیں کی نہ رہے گی...... اور مارے ڈر کے رانو کانپنے لگتی۔ اسے سیلان کی بیماری ہو گئی اور بدن کی چربی یوں گھلنے لگی جیسے جتے توے پر مکھن کی ڈلی گھلنے پگھلنے لگتی ہے۔

رانو کے حساب سے بڑی دن بدن اپنی تقدیر کی تاریخ کے نزدیک پہنچ رہی تھی۔ پچھلے ماگھ کی سنکرانت سے رانو کو بڑی کے نہانے، کا حساب رکھنا پڑ رہا تھا۔ کہیں دو دن بھی اوپر ہو جاتے تو رانو اس سے عجیب طرح کے الٹے سیدھے سوال پوچھنے لگتی۔ "تیسرے پہر کو تو کہاں تھی؟ پھر ایشراں کے ہاں سے کہاں گئی؟ مندر میں کون کون تھا؟ کیوں تو پروہت سے گورو منتر لینے بیٹھ گئی؟ جانتی بھی ہے یہ منتر تجھے کہاں پہنچائے گا؟ بھول گئی باوا ہری داس کو........... ؟" پھر وہ احتیاطاً گھر میں کاڑھا لارکھتی........... جھوٹ اور کفر کو ابال پھینکنے کے لیے........... جب کہیں دھڑکتے پھڑکتے ہوئے انتظار کے بعد اس بلوغ کے بوٹے پہ کوئی نیا گل انار کھل اٹھتا تو رانی کی جان میں جان آتی اور بڑی کو جلدی جلدی گھر سے نکال

---

[1] انگریز

دینے کی سوچ میں لگ جاتی لیکن گھر میں تو بیس کوڑیاں نہ تھیں اسے رخصت کرنے، اپنے گھر بھیج دینے کے لیے .... پھر رانو سوچتی .... وہ خود بھی تو روٹی کپڑے کے وعدے پر چلی آئی تھی لیکن .... پاپی پرماتما نے جب اس کی بچی کو زندگی کی سسرال میں بھیجا تو روٹی کپڑے کا بھی وعدہ نہ کیا .... گانو کے نوجوان لڑکے، ہر دوسرے تیسرے شام ڈبکے جاکر سنیما دیکھنے والے حرامی، بہن اور عورت میں بھی تمیز کرنے کے قابل نہ رہے تھے اتنا تو انھیں سمجھنا چاہیے تھا کوٹلے کی سب لڑکیاں ان کی بہنیں ہیں اور عورتیں مائیں .... اس پر بھی رانو ان میں سے کسی کے ہاتھ میں بڑی کا ہاتھ دے دیتی اور خود اس کے سارے حساب کتاب، اس ڈر سے چھٹی پالیتی لیکن وہ لچے، بدمعاش، سب کے سب مہر کرم دین کے باغ میں سے کھٹے توڑ، کچھ کھا، کچھ پھینک کر بھاگ اٹھنے والوں میں سے تھے۔ ان کی رکھوالی کرنے والا کوئی نہ تھا .... جانے بڑی کی قسمت میں دیروال تھا یا ڈسکہ بڈھا گورا پایا جاکی .... یا دور لاہور، پشاور .... ؟ رانو بیٹھی سوچ کے گزوں سے جدائیوں کے فاصلے ناپتی اور پھر ایک عجیب عمل سے کھینچ کھینچا کر انھیں سکیڑتی، چھوٹا کر لیتی .... اس پر بھی اسے جھرجھریاں آتیں۔ بڑی کی مدد سے وہ اس کے دہیج کا کشیدہ کاڑھتی ہوئی گنگنانے لگتی۔

سجناں ساہورے چلنا، سبھ مکلاون ہار

ایک دن سب کو اپنی سسرال چل دینا ہے۔ ایک دن سب کا گونا ہوگا لیکن اس کا اپنا گونا؟ .... اس کی اپنی سسرال؟ .... جواب مانگنے ہو چکی تھی ....

دماغ اور کشیدے کی اسی ادھیڑ بن میں رانو یہ بھی بھول جاتی وہ گیت زندگی کا نہیں موت کا تھا! .... پھر جیسے اپنے آپ، ایکا ایکی رانو کی صحت ٹھیک ہونے لگتی۔ بدن میں ایک عجیب طرح کا تناؤ پیدا ہو جاتا جو اس کے دماغ تک کی طنابیں کھینچ ڈالتا اور رانو کا من سسرال جانے کے لیے تڑپنے لگتا۔ رانو جب سے کوٹلے میں آئی تھی تلوکے نے اسے سسرال کے

بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہ دیا تھا۔ سسرال نام ہوتا ہے سات پردوں میں لپٹی لپٹائی آنے والی دلھن کا، اس کے سواگت کے لیے گھر کی چوکھٹ پر سرسوں کا تیل گرانے کا، پیچھے باجوں، آگے نظروں کے ٹھٹھے کا، ساس کے چاؤ کا سسر کے ملہار کا "گانی" کھیلنے کا برتن بدلنے کا، منہ دکھائی اور پھر رات موتیا یا کرنے کے پھولوں کا، دیے کی روشنی میں سمٹنے اور پھر کھل جانے کا، ایک بہیمیت کے ساتھ ساتھ ایک اتھاہ مادریت کا.......... لیکن تلوکا جہاں اسے ہر روز دلتا، روندتا ہوا لے جاتا تھا۔ وہ تو سسرال نہ تھی جس میں ہر لڑکی شادی کے بعد جانا چاہتی ہے۔ ہر عورت بیاہ کے برسوں بعد بھی جانا چاہتی ہے.......... رانو ایکا ایکی سسرال اور گونے کے لیے جاگ اٹھی لیکن سسرال اور گونا تو اس کی بیٹی کا ہونے والا تھا نہ معلوم اپنا یا بیٹی کا.......... بیٹی کا.......... اپنا.......... اور رانو کا وہی گیت ایک نوحے میں ڈھل جاتا۔ جنداں کی گالیاں اور ڈرڈر جسے اور دل دوز بنا دیتیں اور وہ گانے لگتی..........

"بچھڑ سے سہیلڑی، بچھڑ و ساتھی نال" سہیلی اس وقت تک بس سکے گی جب تک ساتھی اس کے ساتھ ہوگا۔ جسم اس وقت تک کام کرے گا، جب تک روح اس کی رفاقت کرے گی۔

منگل اور وہی اس کا نصیبوں والا اڈہ۔ منگل نے بکی پر ساز اس پر وہ اوباش..........
لادنا تو سیکھ لیا تھا لیکن خود پہ گھر کی ذمے داری کا جوا نہ پڑنے دیا۔ آمدنی پہلے سے بھی کم ہوگئی۔ زندگی میں ایکا ایکی چونک کر جاگا ہوا منگل، جذبات و شہوانیات کے جنگل میں کھو گیا ابھی وہ زندگی کے سیاق و سباق سے اچھی طرح واقف نہ ہوا تھا لیکن اسے "جاایں جا است" کا احساس ضرور تھا۔ جب بھی کوئی کنواری سامنے سے گزر جاتی تو جیسے اپنے آپ یہ بول اس کے ہونٹوں پر چلے آتے۔

نشے دیے بند بوتلے، تینوں پین گے نصیباں والے

اے نشے کی بند بوتل! تجھے نصیبوں والے پئیں گے.......... اور نصیبوں والے اڈے پر اکا ہانکنے والا منگل یہ بھول ہی جاتا، گھر کی طرف سے بھی اس پر کوئی فرض عائد ہوتا

ہے جہاں سب لوگ اب ایک ہی وقت کھانا کھانے لگے ہیں۔

انہی دنوں منگل کی جہلم ارائین کی چھوٹی بیٹی، سلامتے سے راہ و رسم ہو گئی۔ سلامتے نے نہ صرف ترکاری.......... بھنڈی، بینگن اور توری ہی پر ہاتھ پیر نکال لیے تھے بلکہ اس کا پورا بدن بیل پر لگی ہوئی لوکی کی طرح ہرا ابھرا اور نرم تھا۔ اس پر بھی وہ ہوا کے معمولی جھونکے کے ساتھ جامن اور بکائن تو ایک طرف، کانٹے دار ببول سے لپٹتی پھرتی تھی۔ ایک دن اس نے راہ جاتے منگل کو ٹوکا۔

"اڑیا منگلا!"

منگل جو اکا لے کر نکل رہا تھا گھوڑی کی باگ کھینچ کر رک گیا اور سلامتے کی طرف منہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ سلامتے نے پاس آکر آنکھیں مٹکائیں اور بولی

"ہائے ہائے دے انیاں!.......... ایک بار ہمیں بھی سیر کروا دے.........."

کیوں نہیں سلامتیے" منگل نے حامی بھری "ہو تی؟" کس کی اور گہنے کس کے؟"

"کب کرائے گا؟"

"جب تو کہے "

سلامتیے آگے پیچھے دیکھ کر بولی.......... "آج ہی رات.........."

"ہی" منگل نے کہا "میرا اکا رات کو نہیں چلتا۔"

.... اور وہ بگی اپنی گھوڑی کو چابک لگا کر چل دیا۔ جب وہ ستراہ کے راستے پر دو تین کوس نکل گیا، تب سلامتے کی بات کے معانی اس کی سمجھ میں آئے۔ وہ گانو کی طرف مڑنے ہی لگا تھا کہ سواریاں الف ہو گئیں۔ پھر یہ سوچ کر کہ ابھی تو رات ہونے میں آٹھ دس گھنٹے باقی ہیں، وہ ستراہ کے راستے پر چل دیا۔ گھوڑی کو چابک لگاتے اور کہتے ہوئے.......... "چل میری بکیے، شہر د شہر......"

---

۱ ارے ۲ باندی

شام کو منگل گھر پہنچا تو اپنے اس چھوٹے سے دمشق کی قحط سالی دیکھ کر سارا عشق بھول گیا۔ صبح سے کھانا نہ پکا تھا۔ بڑی نے کچھ چاول اُبالے تھے لیکن بھوکی رانو نے انھیں طباق پہ ڈالا اور بنا نمک مرچ کے کھا گئی، سوکھے ہی نگل گئی۔ ساس سسر تو ایک طرف اس نے اپنے بچوں کو بھی نہ پوچھا تھا اور اب جنداں اسے دھکے دے دے کر باہر نکال رہی تھی ......اور رانی پتھر بنی مار کھا رہی تھی۔ وہ چاہتی تو ایک ہی ہاتھ سے بوڑھی جنداں کے جسم کا رشتہ اس کی روح سے علاحدہ کر دیتی لیکن وہ چپ تھی اور ایک انجانے ڈر سے کانپے جا رہی تھی...... منگل اس منظر کو دیکھ کر ایک مجرمانہ احساس سے بکائن کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ آج اس نے صرف تیرہ چودہ آنے بنائے تھے جو گھر کے نون تیل کے لیے بھی کافی نہ تھے۔ اُسے الٹی طرف کی ایک سواری ملی تھی جو روپیا سوا روپیا دینے کو تیار تھی لیکن سلامتے کے لالچ میں وہ جلدی ہی گاؤں لوٹ آیا۔

منگل نے جنداں کے ہاتھ روکتے ہوئے کہا...... "تائی...... کیوں تو روز اس غریب کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہے؟ کیوں روز مارتی، دھکے دیتی ہے۔ آخر کہاں جائے گی بیچاری۔؟"

رانو جسے اپنے شوہر کے مرنے پر رونا نہ آیا تھا، ایک دم بلک اٹھی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے آنسوؤں کے سیلاب میں کچھ یوں ڈوب گئی کہ لڑھکنے جوگی بھی نہ رہی۔ وہ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی...... "میں کیوں جاؤں؟...... کیا نہیں کیا میں نے اس گھر کے لیے؟ بیٹے نہیں جنے کہ بیٹی نہیں جنی؟......

منگل بولا...... "قصور بھابی کا نہیں، میرا ہے۔"

"تیرا خواہ مخواہ ہی؟" جنداں کڑکی...... "جو عورت اپنے بچوں کی نہیں وہ اور کس کی ہوگی؟" اور پھر رانو کی طرف منہ کرتے ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ بولی "گرو کے واسطے، بھگوان کے واسطے، بوڑھی ماں کے واسطے تو اب جا...... دفان ہو جا۔ جو اندھا کنا

ملتا ہے کر لے..........یہاں سے مر لے..........“

رانو اٹھی، مڑتی ہوئی اس نے جنداں کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو تو تو جنتی ہے ماں.......... جگت ماتا ہے تو تو مجھے مت دھتکار جیسے تیسے بھی ہے مجھے رکھ لے۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں“..........اور اسی ڈر سے وہ سب کے حصے کا کھا گئی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا..........اس گھر میں رہے بھی تو کیسے؟ بچے اب پل چکے تھے، بڑے ہو چکے تھے اور قاعدے سے اب وہ تلو کے کے تھے، اس کے تھوڑے ہی تھے؟ ساس، سسر گانو میں پنچایت کے لوگ لے جانے بھی دیتے تو وہ ان کو لے کر کہاں جاتی؟ خود بھیک مانگتی؟ ان سے بھیک منگواتی؟ پھر..........بنتا، سنتا اور بڑی، ہر ایک سے وہ ایک ہی سا پیار کرتی تھی۔ اب بھی وہ اس کی دیکھ ریکھ کے محتاج تھے۔ ایک کو چھوڑنے..........کا خیال کرتی تو دوسری پسلی میں درد ہونے لگتا، اور وہ سب اتنے چھوٹے نہ تھے کہ ساتھ لے جا سکتی، اتنے بڑے نہ تھے کہ چھوڑ سکتی..........ساس کے اٹھتے جوتا، بیٹھتے لات کے عمل میں رانو بھی اب یہی سمجھنے لگی تھی جس عورت کا پتی مر جائے اسے اس کے گھر میں رہنے کا کوئی حق نہیں، اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر ایک صبح چنوں آئی اور گلے میں بانہہ ڈال کر اپنے گھر لے گئی۔ ساگ کے ساتھ مکی کی روٹی کھلائی جو رانو نے اس ڈر سے تھوڑی کھائی کہ پھر نہ ملے گی اور پھر چنوں مونڈھا سر کا کر رانو کے پاس بیٹھ گئی اور بولی ”دیکھ بی بی! میں تجھ سے ایک بات کہتی ہوں جو مانے تو..........؟“

رانو نے چنوں کی طرف دیکھا۔

چنوں شروع ہوئی ”یہ جنداں بندی، ساس تیری تجھے جینے نہ دے گی۔ اس گھر میں بسنے نہ دے گی..........یہاں رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے..........“

”کیا طریقہ؟“ رانو نے جاننے سے پہلے ڈھارس پاتے ہوئے کہا۔

"وہ یہ کہ تو............ منگل سے شادی کر لے، چادر ڈال لے اس پہ"

"نہیں" رانو ایک دم کھڑی ہو گئی "یہ تو کیا کہہ رہی ہے چنوں"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں............ جب بڑا بھائی پورا ہو جائے تو............"

"یہ نہیں ہو سکتا" رانو نے کہا اور اس پہ ایک لرزہ چھانے لگا۔ منگل............ بچہ ہے۔ میں نے اسے بچوں کی طرح پالا ہے............ عمر میں مجھ سے کچھ نہیں تو دس گیارہ سال چھوٹا ہے............ نہیں نہیں، میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی............"

اور رانو گھر بھاگ گئی............

منگل بکی کے لیے دانہ لے جا رہا تھا، جب رانو گھر پہنچی۔ اندر جاتے ہوئے رانو نے مڑ کر ایک نظر منگل کی طرف دیکھا اور پھر ایکا ایکی، اپنے آپ "نہیں نہیں............ نہیں نہیں" کہتی ہوئی چل دی۔ خود کو جھلنگے میں گرا، منہ چھپا کر رونے لگی۔

گھڑی بھر کے بعد منگل ساز لینے کے لیے اندر آیا۔ آج وہ جلدی نکل جانا چاہتا تھا کہ گھر میں چاول ہی نہیں گیہوں بھی آئیں اور موٹی سی روٹی پکے جیسی کہ پکا کرتی تھی اور جس سے اصل میں پیٹ بھرتا تھا۔ چاولوں کا کیا ہے؟ وہ تو سیدھے پیشاب کے راستے سے نکل جاتے ہیں اور پھر پیٹ خالی، رب والی............ ہو سکے تو ایک آدھ ترکاری بھی ہو جائے۔ جس کے سواگت کے لیے منہ کی سڑک پر ابھی سے چھڑکاؤ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ کچھ نہ ہو تو روٹی کے ساتھ پیاز ہی سہی یا پھر لہسن کی کچھ تُریاں 'ودیا' کے ہاں سے لسی آ ہی جائے گی اور اس میں نمک اور لال مرچ ڈال کر روٹی کھالی جائے گی............ ان سب باتوں سے زبان اور تالو مل کر ابھی سے چٹاخ چٹاخ کرنے لگے............ ایک ہاتھ سے ساز کا گورکھ دھندا سمیٹ کر منگل نے رانو کی طرف دیکھا اور بولا

"کلغی کہاں ہے گھوڑی کی؟"

رانو ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھی۔ پہلے تو اس نے سیدھے منگل کی طرف دیکھا

اور پھر ایکا ایکی گھبرا کر دوسری طرف جھانکتے ہوئے بولی........... "بچے تو گئے مدرسے۔"

منگل نے حیرانی سے رانو کی طرف دیکھا اور کہنے لگا "حد ہو گئی بھئی۔ میں چتر متری کی بات کر رہا ہوں اور تو بچوں کی!"........... اور پھر یہ دیکھنے کے لیے کہ رانو کو ہوا کیا ہے اس نے آگے بڑھ کر اسے چھو دیا۔ رانو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کھڑی ہو کر چلا دی۔

"مت ہاتھ لگا مجھے"

منگل نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا اور اپنی انگلیوں کی پوروں کو دیکھنے لگا۔ پھر اسے کلغی مل گئی جسے ساز میں لگاتے ہوئے بولا "اتنی سیانی، اتنی سمجھ دار ہو کر، اب تک رات کی بات لیے بیٹھی ہے؟"

اور پھر وہ باہر نکل گیا۔

رانو اٹھ کر دروازے تک گئی اور پیچھے سے منگل کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی .... کوئی دیر میں گلی کے نکڑ نے لپک کر منگل کو چھپا لیا۔ اب ہیر گاتے ہوئے اس کی صرف آواز آ رہی تھی ـ

ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ بولیں، کون رٹھڑے یار مناوندا اے

ایسا کوئی نہ ڈٹھا میں ڈھونڈھ تھکی جہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندا اے

ہیر نے کہا، اے جوگی تو جھوٹ کہتا ہے، روٹھے یار کو منانے کون جاتا ہے؟........... میں ڈھونڈتے تھک گئی، ایسا کوئی نہ دیکھا جو جانے والوں کو واپس لے آئے:...........

(۴)

چنوں نے پورن دئی سے بات کی۔ پورن دئی نے اپنے شوہر گیان چند سے، جو گانو کا سرپنچ تھا اور اس وقت کوٹلے کی متنازعہ فیہ زمین کے ٹیلے بیٹے کھدوا کر نیچی زمین پر مٹی ڈلواتے ہوئے راستہ ہموار کر رہا تھا۔ اس نے جورو سے منگل کے گھر کی حالت سنی تو بولا...... "ہاں ہاں، ٹھیک ہے............ رانی بچاری اور کہاں جائے گی؟ کیا کرے گی؟"

اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بول اٹھا............ "مگر منگل تو رانی سے بہت چھوٹا ہے............"

"تو کیا ہوا؟" پورو بولی............ "اسے کون سی ہیر مل جائے گی؟............ گھر میں کھانے کو نہیں، بدن پر کپڑا نہیں۔ دونوں کا کام ہو جائے گا۔ دونوں سکھی ہو جائیں گے" اور پھر گانو کے سرپنچ کو ڈرانے کے لیے وہ کچھ اور بھی اپنے شوہر کے قریب چلی آئی اور کہنے لگی "تم نے سنا، سلامتے سے اس کا؟"

"نہیں نہیں............ نہیں تو"

"میں تو کہتی ہوں............ ان اراعیوں، ان سلوس کو گانو سے نکال ہی دینا چاہیے .... یہ جہلم اور تینوں بیٹیاں اس کی جو بیاہی ہوئی ہیں وہ بھی اور جو نہیں وہ بھی، سب ایسے گھومتی ہیں جیسے کتیا............"

"تو کہے جائے گی یا مطلب کی بات بھی بتائے گی؟" گیان چند نے بے صبری سے کہا............ اور بولا "کچھ ہوا؟"

"ابھی تو کچھ نہیں............ ہاں ہو جائے گا۔"

گیان چند کیا امید لے کر سننے آیا تھا لیکن سب مزا کرکرا ہو گیا............ وہ بولا "کچھ ہوا تو............ وہی حال ہو گا اس کا جو چودھری مہربان داس کا ہوا............ لوہے کے لنگوٹ والے بابا ہری داس کا ہوا۔"

پورن دئی نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

گیان چند معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "مت یہ سمجھنا اب کے مقدمے میں صرف مرد ہی بھگتیں گے............ جب تک عورتیں برابر کا حق نہیں مانگتی تھیں، ٹھیک تھا............ اب لیں برابری کا حق"

"میں ایک بات پوچھتی ہوں" پورن دئی نے کہا "تم نے جہلم کو دھرم شالہ میں کیوں بلوایا ہے؟"............ وہ اندر ہی اندر ہری داس کے نام کی بس گھول رہی تھی!

"دھرم شالہ میں کہاں بلوایا ہے؟............ وہ تو مہر کرم دین کے باغ میں......"

گیان چند نے کچھ ہکلاتے، پھر فوراً ہی راستہ پاتے ہوئے کہا۔

"مسلمانی ہو کر وہ دھرم شالہ میں کیسے آسکتی ہے؟"

اچھا............ اب دھرم شالہ کی جگہ کرمو کے باغ نے لے لی؟"

"ارے نہیں ری سودائن............ اس نے باغ کے سب کیلے توڑ لیے۔"

"تمھارے باغ کے تو نہیں توڑے؟"

"باڑ مضبوط تھی۔" گیان چند نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نہیں تو وہ کیا کمی کرتی؟"

"باڑ مضبوط تھی یا پہلے ہی آتے جاتوں نے توڑ لیے............؟"

گیان چند کا چہرہ سیاہ پڑ گیا............ پورو سے نظریں بچاتے ہوئے وہ بولا۔

"اچھا اچھا............ تو بات کرنے آئی تھی منگل کی............"

"منگل کی نہیں، رانی کی۔" پورو نے تردید کی۔

"رانی کی سہی۔" گیان چند بولا "میں تو کہتا ہوں اسے منگل کے ساتھ چادر ڈ،

ہی لینی چاہیے......... یوں بھی گانو میں آئی ہوئی عورت باہر کیوں جائے۔ اِدھر اُدھر کیوں جھانکے؟......... اس میں گانو کے ہم سب مردوں کی بدنامی ہوتی ہے.........“

اور پھر مزدوروں کی طرف منہ کرتے ہوئے گیان چند نے بلند آواز سے کہا ”کامیو گھبر دو......... سب زمین برابر کردو، کہیں بھی اونچ نیچ نہ رہے.........“

اور تن آور جوان کسیوں اور کدالوں سے کام میں لگ گئے......... ان کے جسموں پر تیل لگے، کسے ہوئے پٹھے دور دور تک ہوا میں جلوتیاں مارنے، روشنی میں چمکنے لگے...... اور گیان چند سوچنے لگا۔ ہمارے دیش پنجاب میں جہاں عورتوں کی کمی ہے، کیوں مردوں سے ان کا حق چھینا جائے؟ کیوں ایک عورت کو بے کار جلنے سڑنے دیا جائے؟ پھر وہ گانو کی پنچایت سے الگ اور حضور سنگھ کی بھائیہ برادری سے الگ ملنے کے لیے چلا گیا.........

منگل کی غیر حاضری میں کچھ لوگ بڑی کو دیکھنے آئے تھے۔ بڑی معصوم کچھ نہ جانتی تھی۔ داوی کے کہنے پر مہمانوں کی خاطر خدمت کے لیے دوڑ کر چنوں کے وہاں سے برفی لے آئی جس میں ماوا کم تھا اور شکر زیادہ۔ نفع گیر دکانداروں نے ایک سیر مادے سے پانچ سیر برفی بنائی تھی اور شہر کی یہ بیماری گانو تک چلی آئی تھی......... وہ تین آدمی تھے، ایک ادھیڑ عمر کا، تقریباً بوڑھا......... اور باقی کے دو......... جوان......... ایک تو صاف اس بوڑھے کا بیٹا معلوم ہوتا تھا اور دوسرا شاید اس کا دوست تھا۔ ہو سکتا تھا بھائی ہی ہو لیکن شکل باپ پر نہ گئی ہو......... داوی کے اشارے پر وہ بڑی کو اٹھتے بیٹھتے، اندر آتے باہر جاتے دیکھ رہے تھے۔ نگاہوں سے تول رہے تھے۔ نوجوان کی نگاہیں تو پھر اُچٹ کر پڑتی تھیں لیکن بوڑھے کی سیدھی......... اور جہاں پہنچتیں وہیں چپک جاتیں......... آخر جب بڑی نیچے گھڑے میں سے پانی ڈالنے کے لیے بیٹھی اور پھیلی تو بوڑھے نے ہنکارتے ہوئے کہا ”ہاں“

اور پھر بولا، ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے۔“

اسی وقت بڑی کے ماتھے پر کسی خیال کی پرچھائیں گزری اور اس سے پہلے کہ داوی

جنداں اسے باہر جانے کا اشارہ کرتی، بڑی ایک ہی زقند سے باہر بھاگ گئی اور اپنے پیچھے ایک ایسی خوشبو چھوڑ گئی جو نوخیز لڑکیوں ہی کے بدن سے آتی ہے............

ہزار روپے سے آتے آتے ساڑھے پانچ سو پر فیصلہ ہوا۔ اس پر جنداں کو سوچنے کا موقع دے کر اپنی تسلی تشفی کرتے ہوئے وہ لوگ چلے گئے۔ حرافہ نے موقع بھی ایسا تلاش کیا تھا جب کہ رانو گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ کپاس چننے گئی تھی۔ جنداں اب سوچ رہی تھی .... یہ رقم ان لوگوں سے لے گی کیسے؟ لڑکی انھیں دے گی کیسے؟............ رانو سے تو پوچھنا ہی پڑے گا لیکن اسے تو وہ اپنے دل سے اپنے گھر سے ہمیشہ کے لیے بیگانہ کر چکی تھی۔

رانی لوٹی تو جنداں اس سے لیپو پوتیاں کرنے لگی اور جب اسے پاس بٹھا کر، جنداں نے اس کی بغل میں اپنی بوڑھی............ جھریوں ماری بانہہ ڈالتے ہوئے کہا............ "تو جنم جنمانتر کی بہو میری" تو رانو کا ماتھا ٹھنکا۔ جب ہی بڑی نے باہر سے آتے ہوئے ماں کو اندر آنے کا اشارہ کیا جسے جنداں کی تقریباً اندھی آنکھیں نہ دیکھ سکیں۔ رانو اٹھ کر اندر گئی تو بڑی نے اپنی ٹھیٹ زبان میں ماں سے سب کہہ دیا۔ ساڑھے پانچ سو کی بات بھی سنا دی ......وہ دروازے کے پیچھے سے سب سنتی رہی تھی۔

رانو، بڑی کے منع کرنے پر بھی لپک کر باہر چلی آئی۔ وہ اپنی اوقات، اپنی ہمت، اس گھر میں اپنا درجہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ وہ اس کڑک مرغی کی طرح تھی جو اپنے انڈے بچوں کو بچانے کے لیے شکرے اور باز پر بھی جھپٹ پڑتی ہے۔ "آج کون آیا تھا یہاں؟............ کس کی ہمت پڑی یہ دہلیز پھاندنے کی؟ میری بیٹی کا سودا کرنے کی......؟"

جنداں ایک "عورت" قسم کی مدافعت پر اتر آئی............ "نہیں وے رانیے وہ تو ایسے ہی بات کر رہے تھے۔ اب ہر کسی کا منہ تھوڑا پکڑا جا سکتا ہے؟"

"ہاں پکڑا جا سکتا ہے، جھلسا جا سکتا ہے۔" رانو کوئی سن تھوڑے ہی رہی تھی۔ ان

حرام جادوں کی جہان کاٹ دیتا تھی۔ منہ میں لٹ لٹ کرتا ہوا ٹھونس دیتا تھا...... میری بیٹی جس کی ایک ایک بانہہ، ایک ایک انگلی، ایک ایک پور لاکھ لاکھ کی، اس کی ایک ایک تکّی میں سو سو موکھاں ہے۔ لوگوں کی ایک ایک نجر میں عمر قید........"

"تیری بیٹی ہے۔" جنداں بولی "میری بھی تو کچھ ہوتی ہے، میری بھی تو پوتی ہے۔"

"پوتی بہو سے ہوتی ہے، جب بہو ہی نہیں، تو پھر پوتی کیسی؟"

اور پھر ایک لمبی سی، گھسٹتی ہوئی "کھسم دار" کہتے ہاتھ لپکاتے ہوئے رانو اندر چلی گئی آخر........ وہی جھلنگا، وہی رونا........ ہائے اب میں بیٹی کو بکتے دیکھوں گی؟ میں تو صرف کچھ لے کے نہیں آئی تھی تو یہ درد شا ہوئی........... یہ تو بک جائے گی!......" اور وہ بات بات پہ اس کی ہڈیاں توڑیں گے، نوچ نوچ کے کھائیں گے، کہیں گے تجھے ایسے ہی تو نہیں خرید کے لائے ہیں، دام دیے ہیں........ تلو کے مرحوم کے زمانے میں آخری یہی حربہ تھا رانی کا........ "دیا تو نہیں دیا........ لیا تو کچھ نہیں؟ بیاہ کر لائے ہو کھرید کے تو نہیں لائے؟"........ اور یہ بیٹی میری بک جائے گی........ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں۔ بیاہ ہو گا بھی تو کیسے۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا........ آج مہربان داس چودھری ہوتا، ایک ہی رات میں بیٹی کا جہیز تیار کر لیتی اور پھر اسے اپنے سامنے طوطیاں بجاتی، ناچتی، گاتی ہوئی برات، سہرے باندھے ہوئے لڑکے کے حوالے کر دیتی اور جب ڈولی اٹھتی تو دور کھڑی دیکھتی، روتی، دیکھتی........ لیکن کبھی نہ کہتی...... "بیٹی! تیرے سہاگ کے لیے رات ایک ماں نے اپنا سہاگ لٹا دیا........"

پھر........ پانچ ساڑھے پانچ سو ملیں گے تو یہ پھاپھاں مجھے کچھ دے گی تھوڑے ہی........؟ آخر........ بیچنا ہی ہے تو ایک ہی بار ساڑھے پانچ سو میں کیوں، کیوں نہ میں اسے لے کر شہر نکل جاؤں اور تھوڑا تھوڑا کر کے بیچوں؟ لاہور میں سیکڑوں ہزاروں بابو

۔ نیچی ہوئی کوئی ؎ نظر ؎ سوراخ

لوگ پھرتے ہیں جو کچھ دیر کے دل بہلاوے کے لیے پندرہ پندرہ بیس بیس روپے دے جاتے ہیں۔ کھانے کو چنگی چوکھی ملے گی، پہننے کو ریشم کھین کھین کھاب!...... تھوڑے ہی دنوں میں روپوں اور کپڑوں سے صندوق بھر جائیں گے ....

جب ہی زنانے کے ایک تھپڑ کی آواز سنائی دی جو رانو نے خود ہی اپنے منہ پر مارلیا تھا......اور اب ہمیشہ کی طرح ایک انجانے خوف سے کانپنے لگی تھی۔

"جنداں رانو کا آخری فقرہ سوچ رہی تھی ...."پوتی بہو سے ہوتی ہے جب بہو ہی نہیں تو پوتی کیسی؟" اسی وقت گیان چند، کیسر سنگھ، جگو، دلا، کرم دین اور گانو کے دوسرے آدمی چلے آئے اور آکر حضور سنگھ کے پاس بیٹھ گئے۔ جنداں کو بھی بلوالیا اور رانی کے چادر ڈالنے کی بات یوں چھیڑ دی جیسے یہ بھی کوئی جھگڑا ہے جس کا فیصلہ پنچایت کو کرنا چاہیے۔ چادر کی رسم کی بات شروع ہو گئی۔ حضور سنگھ نے سمجھا..........اس عمر میں جبکہ وہ مرنے کے قریب ہے، پنچایت، برادری کے لوگ اس کی بے عزتی کرنے، اسے آخری ٹھوکر مارنے آئے ہیں لیکن جنداں عورت کی سریع الفہمی سے یکایک بات کی تہہ تک پہنچ گئی بلکہ اس سے بھی کہیں دور آگے، بہت آگے نکل گئی۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا ......اتنا نزدیک، اتنے قریب کا خیال اسے پہلے کیوں نہ آیا؟ پھر اسے یاد آیا ہاں، ہاں! آیا تھا لیکن جب بڑی کتنی چھوٹی تھی۔ اب رانو پھر اس کی بہو ہو سکتی ہے اور بڑی اس کی پوتی...... اور...... جب حضور سنگھ نے پنچوں کی طرف دیکھ کر آنکھیں پھڑپھڑائیں تو بوڑھی دانت نکال کر اس کی طرف بڑھی۔ ڈبو کی بوڑی مری تھوڑی تھی؟......... وہ تو زندہ تھی .... جنداں...... جنداں بولی "تو بیچ میں مت بولا کر، بڈھے! نہ مرے نہ جان چھوڑے ...... جانتا بھی ہے کیا کیا انصاپھ ہو رہے ہیں اس دنیا میں؟.......... کہ اس جنم کا اندھا تو اگلے جنم کا بھی اندھا......"

پنچ موجود تھے جنھوں نے بڈھے بڈھی کا بھی فیصلہ کرا دیا اور آخر حضور سنگھ اور جنداں دونوں کی منظوری لے کر چلنے لگے۔ ان کے جانے سے پہلے بزرگ ہونے کے ناتے جنداں نے سب کو آشیر واد دی............ ان سب کے پیٹھ موڑنے کی دیر تھی کہ رانی بھری بپھری ہوئی منظر پہ چلی آئی.......... "تو تو بڑی کے بیاہ کی بات کرنے جا رہی تھی، بھا پھاں بیچ میں میرا مردہ کیوں نکال بیٹھی؟"...... اور وہ بکے جا رہی تھی......... "شرم ہے تو کچھ کھا مر........ گھر میں بیسیوں ہولدلیاں پڑی ہیں وافر........... ہے دیوی ماں! یہ جوہڑ کے گدلے پانی میں ڈوب ڈوب مرے۔ اوپر سے آٹے والی مشین کو کوکرے.......... تو میرے چنوں سے کیوں نہیں کر لیتی؟ بنتے کے ہاں کیں نہیں بیٹھ جاتی؟ سنتے پہ کیوں نہیں چادر ڈال لیتی؟ میں اس سے بیاہ کرنے جاؤں گی جسے میں نے چھاتی نکال نکال کر........."

جب ہی کوئی ہاتھ رانی کے بالوں پر پڑا اور وہ الٹی ہوئی دیوار کے پیچھے کوڑے کے ڈھیر پر جا گری۔ اٹھی، نظریں صاف ہوئیں تو سامنے چنوں کھڑی تھی اور دانت پیس رہی تھی.......... رنڈیے، کھسم کھانیے، ایدھر مر"......... اور پھر اسے مکان کے پیچھے کھولے میں، جہاں گانو کے لڑکے لڑکیاں رات کے اندھیرے میں ملا کرتے تھے اور یا چور سیندھ لگاتے تھے، لے جاتے ہوئے بولی.......... "ہم تیرے بھلے کی کریں کتیے!....... اور تو پھیلتی جائے؟

"نہیں چنوں، نہیں" رانو نے اس کے سامنے دکھڑا روتے پانو پکڑتے ہوئے کہا "وہ بچہ ہے...... میں نے کبھی اسے ان نجروں سے نہیں دیکھا"

چنوں بولی دیکھ .... تجھے اس دنیا میں رہنا ہے کہ نہیں رہنا؟ اس پیٹ کا نرک بھرنا ہے کہ نہیں بھرنا؟ اس اپنی شرم کو ڈھانپنا ہے کہ نہیں ڈھانپنا؟ بڑی آئی ہے نجروں والی.......... کہا نہیں تجھے شاہ نے؟

بُلھیا رب دا کیہہ پاتا

ایدھر دن پٹنا اودھر لاتا

بس ادھر سے نکال کر اُدھر ڈال دینے کی بات ہے.......... پہلے اسے ان نجروں سے نہیں دیکھا تو اب دیکھ مُردیے

رانو اپنے تصور میں منگل کو دیکھ رہی تھی!

چنوں بولتی چلی گئی.......... سوچ تو موئیے! دو شادیاں یہاں کس ماں جائی کو ملتی ہیں کرنے کو؟ جس کے ساتھ ہو گئی سو ہو گئی۔ بیچ میں دو چار ہو جاتے ہیں لیکن وہ کوئی اچھی بات ہے؟ ہر بکت ڈر سے جان نکلی رہے.......... ہاں! مردوں کی بات الگ ہے...... یہ دنیا ان کی.......... کوئی پوچھتا بھی ہے؟ کوئی جو باہر سے آکر تیرے منگل سے کرے گی تو کیوں نہ کرے؟...... سلامتی کی سنی ہے نا تو نے؟.......... کھیر، وہ سب باتیں چھوڑ تجھے اپنی بیٹی کا بیاہ بھی کرنا ہے کہ نہیں کرنا؟......"

رانو پھر چونک گئی.......... اپنا بیاہ کہ بیٹی کا؟.......... اپنا.......... وہ بچوں کی طرح نہ نہ کی ضد کرتے چلی گئی اور گھر پہنچ کر دن بھر بیٹھی سوچتی رہی، سوچتی رہی جب ہی ایک اور ہی آگ اس میں لپک آئی جس کا تعلق بڑی سے تھا نہ چھوٹے دو بچوں سے..........

اور نہ چنوں سے.......... کوئی اور ہی ناپید بچے اس کے پیٹ میں مچلنے لگے تھے۔

شام کے قریب پورو آئی تو رانو بیمار پڑی تھی۔ ایک پٹی سی سر کے گرد کس کر باندھ رکھی تھی۔ بڑی چنوں موسی کے یہاں سے جاکر آٹے کی چڑیاں سی بنوا کر لے آئی تھی اور رانو نے انھیں اپنی کنپٹیوں پر چپکا رکھا تھا اور وہ چڑیاں دانہ دانہ کر کے رانو کی ساری گرمیاں چن رہی تھیں۔ پورن دئی نے تھوڑی مزاج پرسی کی اور پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیوں نی .... کیسا بکھار ہے؟ اور رانو منہ موڑ کر مسکرا دی۔

اس پر پوری کائنات ایک مخدوش سے طریقے پر کھل اٹھی۔ پورو ہنسی۔ بڑی کچھ نہ

جانتے ہوئے بھی ہنسی کے اس اکاؤ کا موقع سے فائدہ اٹھا کر کھلکھلا اٹھی .... نہ معلوم کب اور کیسے سنتوں، مہاتماؤں، رادھے کرشن اور شیو پاروتی کی تصویریں اپنے آپ چوکھٹوں میں جا ٹکی تھیں اور ان دیوی دیوتاؤں کے چہروں پر دنیا بھر کی محبت کا نقش دوام ہو گیا تھا۔ بڑی کی کھلی سے بکائن پہ آئے ہوئے توتے چہچہاتے ہوئے اڑ گئے۔ مندر کے سنہری کلسوں پر سورج نے اپنا آخری گلال کھنڈ دیا.................. اور گھنٹیاں بجنے لگیں......

ایک دم.......... ایک دم کہیں سے منگل آ کر دروازے میں کھڑا ہو گیا وہ خوش تھا بہت خوش۔ آج اس نے سات روپے کمائے تھے جو اس نے معمول کی طرح آتے ہی رانو کے ہاتھ میں تھما دیے اور پورن دئی بول اٹھی "لے۔ یہ پہلی کمائی، وہ کمائے تو کہا۔ اور رانی نے گھبرا کر پیسے ہاتھ سے چھوڑ دیے۔ نوٹ بھنڈارے کی طرف اڑنے لگا اور سکے کچے فرش پر گر کر کونے کھدرے تلاش کرنے لگے۔ منگل نے حیران ہوتے ہوئے کہا " ہنس کیوں رہی ہو، چاچی؟"

چاچی بولی.......... "یہ تو اپنی اس سے پوچھ" اور پھر اسے گھبرائی ہوئی رانی کے پاس اکیلے میں چھوڑ کر، بڑی کو باہر گھسیٹتی ہوئی پورن دئی چلی دی۔

منگل، بیچپے، بیوقوفوں کی ایک مخصوص، پر خلوص ہنسی ہنسا اور کہنے لگا "کوٹلے کی سب عورتیں اس قابل ہیں کہ............"

رانو نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی "مرد کم ہیں؟"

منگل کچھ نہ سمجھا.......... دونوں اپنے اپنے جال اور اس کی گھنڈیوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ منگل نے اپنی ٹرنکی میں سے کرتی اٹھائی جو کبھی بھلے زمانے میں اس نے پشاور سے منگوائی تھی جس کے گلے پر اون کا کشیدہ تھا اور لوکاٹھ کے پھول سے بنے تھے۔ اسے ہاتھ میں لے کر، لہراتا ہوا وہ باہر نکلنے لگا.......... کہتے ہوئے...... "کم سے کم مردوں کی بات سمجھ میں تو آتی ہے.........."

"مردوں کی مردوں کو سمجھ میں آتی ہے" رانو بولی "اور عورتوں کی عورتوں کو" اور پھر اس نے آنکھیں مٹکائیں، جو فن اسے لاکھوں کروڑوں صدیوں سے آتا تھا، منگل نے جی ہی جی میں سوچا.......... رانی ٹھیک کہتی ہے کیا اسے معلوم تھا، آج ڈھارے کے گھپ اندھیارے میں جہاں چودھری کے مکان کا ملبہ پڑا ہے، شہتیر کے پیچھے میں اور سلامتے ایک نئی ہی عمارت کی نیو رکھ رہے ہوں گے؟ اس نے دروازے میں سے مڑ کر رانی سے کہا" یہ تو آج کیا مرد عورت کا جھگڑا لے بیٹھی ہے؟"

"وہی تو جھگڑا ہے سارا؟"

"کرکھیترا کی لڑائی ہے؟"

"اس سے بھی پرانی۔" رانی نے جواب دیا اور پاس آتے ہوئے بولی "جس میں جیتا ہوا بھی ہارا اور ہارا ہوا بھی ہارا۔"

منگل رک گیا اور رانی کی بات کا کوئی گہرا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو نوں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے لیکن وہ سماں تھا جب کوئی بھی بات کر دو تو مطلب بن جاتا ہے اور کبھی کچھ بھی کہو مطلب نہیں بنتا۔ اس وقت مطلب تھا یا نہیں اس کے لیے دماغ چاہیے تھا یا وقت، اور دونوں کے پاس یہ دونوں چیزیں نہ تھیں.......... رانو تینتیس چونتیس برس کی بھرپور عورت تھی جس میں نسائیت انگڑائی لے کر جاگی تھی۔ اس میں نوعمر نوخیز لڑکی جیسی رعونت تو نہ ہو سکتی تھی۔ البتہ عورت پنے کا پورا غرور تھا جو برسوں، صدیوں سے حالات کے رڈے در رڈے کے نیچے دب کر رہ گیا تھا اور اس وقت ابل کر اچھل کر نکلتا جب اوپر کی سطحیں کمزور ہو کر راستہ چھوڑ دیتیں.......... بہ خلاف اس کے منگل، چوبیس پچیس برس کا جوان، گبھرو، شروع ہی سے دریا اور آخر دریا، جو منبع کا محتاج تھا نہ دہانے کا اور نہ کناروں کا۔

---

1 کورو کشیتر

باہر آ کر رانو نے یوں ہی برتن ٹکرانے شروع کر دیے جو وہ چاہتی تھی وہی ہوا۔ منگل سلامتے کے پاس جانے سے رہ گیا۔ ماں جنداں نے بیٹے کو آواز دی اور جب وہ پاس آیا تو اسے بٹھا کر باتیں کرنے لگی۔ رانی مصلحتاً سٹک گئی۔ بڑی کو اور جڑواں بچوں کو کھیلنے کے لیے باہر بھیج دیا گیا۔ رانی جا کر دروازے کے پیچھے کھڑی ہو گئی جو ہماری دنیا کی اکثر عورتوں کی جگہ ہے۔

جنداں نے ابھی بات چلائی ہی تھی کہ منگل سمجھ گیا۔ پگڑی میں سے اس کے بال پیچھے اپنے آپ باہر آنے لگے اور وہ انہیں ایک ہاتھ سے اٹھا، دوسرے ہاتھ کی انگلی سے اندر کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دیے کی مٹ میلی روشنی میں اس کا چہرہ خون کے ایکا ایکی دورے سے لال ہوتا ہوا دکھائی دینے لگا..........

رانی نے کواڑ کے پیچھے چھپ کر، دیوار کا سہارا لیتے ہوئے، دل پر ہاتھ رکھ دیا' منہ سے جس کی دگڑ دگڑ سنائی دے رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی خونی، اوپر کی منزل پر کسی کا خون کر کے اب بھاگنے کے لیے جلدی جلدی سیڑھیاں اتر رہا ہے۔ کوئی دیکھتا وہ کیسے ایک دم توریے کے بے بہارے پھول کی طرح پیلی، کملائی اور مرجھائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ دیوان شاہ کی دکان پر بکنے والے پرانے چھوہاروں کی طرح سکڑ چکے تھے اور گھٹنے آپس میں ٹکرا رہے تھے جیسے محبت یا خوف کے یک بارگی حملے سے لوزتے ٹکراتے ہیں..........

منگل نے اٹھ کر اندر کی طرف دیکھا جہاں اس کے قیاس کے مطابق رانی گئی تھی...... "نہیں یہ نہیں ہوگا، یہ کبھی نہیں ہوگا۔" اس نے بائیں ہاتھ کو ایک فیصلہ کن جھٹکا دیتے ہوئے کہا' جیسے وہ چھانٹے کو دیا کرتا تھا جب گھوڑی، بکی کو ڈکی میں ڈالتا ہو۔ پھر وہ بولا " میں ماں کی گالی نہیں کھاتا.......... ان پنچوں کی ماں کا.......... یہ تو کیا لاٹ اِروِن جارج پنجم بھی آ جائے تو میں یہ کبھی نہ کروں۔ میری ماں کے برابر اس کی عمر ہے.......... میں سر

اس کے پانو پر رکھ سکتا ہوں، پانو سر پر نہیں.........."

اور وہ بکتا جھکتا، اِدھر اُدھر تمرّے سناتا، ہوا کو گالیاں دیتا ہوا باہر نکل گیا اور منڈیر پر ایک سایہ سا لہرایا اور پھر پیچھے ہٹ گیا.........."ہائے نی!..........نی.........." جنداں نے چلاتے ہوئے کہا.........."رانیے! اٹھی!..........دیکھ کہیں اپنے آپ کو کچھ کر ہی نہ لے..........کہہ کے گیا ہے، گھر میں ایک اور تلو کے کی لاش آئے گی.........."

رانو لپکی، گری، پھر لپکی حتیٰ کہ..........دروازہ کے پاس جا پہنچی جہاں چنوں پورن دئی، ودیا وغیرہ نے اسے جکڑ لیا۔

رانی اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے بولی "ہائے نی، ہائے نی.........." اور اس نے اندھیرے کی طرف اشارہ کیا۔

"کچھ نہیں کرے گا۔" چنوں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ہائے! کچھ کر لیا اس نے تو میں مر جاؤں گی..........ہم سب مر جائیں گے سب کا ٹھیکرا[1] مجھی پہ ٹوٹے گا۔"

"تو مر رہنا۔" ودیا نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "ٹھیکرا توڑنے والی اور کون ہیں، ہم ہی ہیں نا؟"

"ہے دیوی ماں..........میرا تو سارا بدن ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" رانو اپنے تشنجی ہاتھ چھاتی پر رکھتی اور پھر پورو کا سہارا لیتے ہوئے بولی۔

چنوں رانی کے ہاتھ دباتے، اسے ہوش میں لاتے ہوئے بولی "تجھے ہی تو گرم کرنے کے لیے یہ ساری مصیبت کی ہے..........کیا برف ہوئی جا رہی تھی۔"

"مجھے بچا لو چاچی!" رانی نے پورن دئی کے پیر پکڑتے ہوئے کہا۔

پورو نے اپنے پیر چھڑا لیے اور بولی "مری کیوں جا رہی ہے؟......" کچھ ہونے

---

[1] ٹھیکرا = الزام لگے گا

ہوانے والا نہیں۔ ان موئے مردوں پر جب لادی ڈالی جاتی ہے سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہم عورتیں یہ نہ کریں تو سب کی سب دھری رہ جائیں............ تو تو جانتی ہے"

رانو کو کچھ حوصلہ ہو گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا اور بدستور لرزتی کانپتی ہوئی چنوں کی طرف دیکھ کر بولی "وہ کیا کرے گا؟"

"جو تو نے کیا" چنوں نے کہا۔

"کیا سوچے گا؟"

جو تو نے سوچا............"

بڑی پاس کھڑی سن رہی تھی اور اب تک معاملے کو کچھ کچھ سمجھ چکی تھی۔ وہ ایک دم بولی............ "ماں نے یہ سب کیا تو میں کچھ کھا مروں گی۔"

اس پر سب عورتوں نے اپنی اپنی ناک پر انگلی دھرتے ہوئے ایک لمبی گھسٹتی ہوئی "ہو، ہائے...." کی اور پھر چنوں نے بڑھ کر بڑی کی چوٹی کھینچ ڈالی اور باقیوں نے دھکے دے کر اسے اندر بھیج دیا............ بڑی جب اندر گئی تو شرر نفرت اور کدورت سے اس کا چہرہ سوج رہا تھا............"

(۵)

منگل ڈھارے میں پہنچا۔ سلامتی کوٹھے کوٹھے ہوتی ہوئی منگل کے گھر جا کر جھگڑا ہوتے سن آئی تھی جو اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ اب وہ لوٹ کر منگل کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے دماغ میں ایک "بولی" تھی جسے وہ منگل کو سنانا چاہتی تھی۔

ہسدی نے چند منگ لئے یار چھڈ گیا گلی دا آنا

ہنسی ہنسی میں جھوم کر یا مانگ لیا کہ یار نے گلی ہی میں آنا چھوڑ دیا!

جب ہی سامنے منگل دکھائی دیا.......... وہ غصے سے ہانپ رہا تھا۔ ایک پل ٹھٹھکنے کے بعد وہ آکر سلامتی سے کچھ دور کھڑا ہو گیا۔ سلامتی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آئی اور منگل کی خاموشی میں ہزار مطلب تلاش کرنے لگی۔ اور پھر ہزار مطلب میں ایک ہی مطلب......

وہ آج بن ٹھن کے آئی تھی اپنی بڑی، بیاہی ہوئی بہن عنایتی کا دوپٹہ اڑا لائی تھی جس پر مُقیش لگی تھی جو کہیں دور سے آتی ہوئی روشنی میں چمک چمک جاتا تھا۔ شام کی ہلکی ہلکی ہوا میں سلامتی کے بدن پر لپٹا ہوا دوپٹہ یوں کانپ رہا تھا جیسے چیٹھے کی مٹھائی پر لگا چاندی کا ورق کانپتا ہے۔

منگل کی آنکھیں، اندھیرے کے باوجود ایک مشعل کی طرح جلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ سلامتی کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا پانو ملبے کے پاس پڑے ایک شہتیر پر رکھ دیا جس کا بہت سا حصہ لوگ کاٹ کر جلانے کے لیے لے جا چکے تھے۔ آہستہ مگر مضبوط آواز میں منگل پکارا........ "سلاتیے!"

"ہوں!"........ سلامتی ایک میٹھی سی آواز میں بولی۔

"ادھر آ" وہ بولا اور سلامتی جواب دیے بغیر منگل کے پاس آگئی، رک گئی..........

"اتار دے دوپٹہ" منگل بولا۔

سلامتی نے دوپٹہ الگ پھینک دیا۔

"نکال دے قمیص۔"

سلامتی نے قمیص اتار دی.........ایک لڑکی کے لیے سب سے مشکل بات لیکن اس لمحے کی سولی پہ لٹکی ہوئی تھی اپنا ارادہ ہی کھو بیٹھی تھی۔ دلیاں ہاتھ بائیں اور بایاں ہاتھ دائیں شانے پر رکھے وہ تھوڑا جھک گئی۔

شاید وہ کچھ کہتی لیکن منگل نے اندھیرے میں، کہیں دور سے، اپنا آپ چھڑا کر آتی ہوئی دیے کی لو میں سلامتی کی طرف دیکھا اور اسی وزنی آواز میں بولا...... "ہو گئی سیر..........اب چلی جا.........."

سلامتے نے بھونچکی ہو کر اپنے کپڑے اٹھائے۔ جلدی جلدی قمیص گلے میں ڈالی اور پھر گھبراہٹ اور دہشت کے عالم میں آگے دیکھتی، پیچھے مڑتی ہوئی چل دی۔

اسی وقت کوئی پاس سے گزرا اور جیسے خاموشی کا منہ پاٹنے کے لیے بول اٹھا "کون ہے اوئے؟" منگل نے ایک دم تاؤ میں آکر نتھنے پھلا لیے اور بولا "تو کون ایں اوئے ماما؟"

اور وہ آدمی لمحے بھر کے لیے ٹھٹک کر اپنی راہ پہ ہو لیا.........وہ مقتول نہ تھا!

منگل کچھ دیر وہیں کھڑا ارد گرد کی فضا کو سونگھتا رہا اور پھر ایکا ایکی بائیں ہاتھ کو چھانٹا لگانے کے انداز میں جھٹک کر، سلامتے کے گھر کی طرف، ساہنسیوں کی ٹھٹی میں کہیں غائب ہو گیا.........ساہنسیوں کی ٹھٹی جو ہمیشہ گانو کے ایک طرف ہوتی ہے جہاں ارائیں چھمبے[1]، چمار، مصلی وغیرہ رہتے ہیں اور جس کی طرف گانو کی گندی موریوں اور بدرووں کا نکاس ہوتا ہے۔

---

[1] حوبی

(۶)

پنچوں کی مقرر کی ہوئی تاریخ آپہنچی۔ پورو، چنوں اور ودیا نے مل کر رانو کے ہاتھوں پر مہندی لگادی اور کنگھی کر کے اس کی مینڈھیاں گوندھ ڈالیں اور سر پر خوبصورت سا ڈاک بنگلہ، بنادیا...... اتنا دلاسا دیے جانے کے باوجود رانو کانپ رہی تھی، رو رہی تھی......

بچے ناسمجھی کے عالم میں چپ تھے اور سوچ رہے تھے......... آج ان کی ماں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ بڑی ان کے گلے میں اپنی لانبی لانبی بانہیں ڈالتی ہوئی، چپ کرانے کے بہانے انھیں رلا رہی تھی اور پھر......... جیسا کہ بندوبست کیا گیا تھا سب بچوں کو چنوں موسی کے گھر بھیج دیا گیا۔

آنگن میں پنسیی کی میلی سی چادر تنی تھی جس کے نیچے کچھ گھڑے رکھے تھے...... ایک طرف پرانی سی کائی ماری ٹھلیا پڑی تھی اور ان سب پر سیندور مچل رہا تھا۔ رانو کو لا کر جب چادر کے نیچے بٹھایا گیا تو اس نے ایک دلدوز چیخ ماری۔

"......... مرنے والے! آدیکھ، کیا ہو رہا ہے تیری رانی کے ساتھ........."

روہت نے کہا......... "لڑکا کہاں ہے؟"

پنڈت گیان چند، کیسر سنگھ اور دوسرے لوگوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ تو اسے زبردستی پکڑ کر لائے تھے اور چارپائی کے ساتھ باندھ دیا تھا......... مہر کرم دین جو اس رسم ورواج سے ذرا پرے ہٹ کر بیٹھا تھا ڈھونڈتا ہوا اندر گیا اور الٹے پیروں لوٹتے ہوئے بولا "منگو تو اندر نہیں ہے!"

اس دن اتر سے آنے والی ہوا، طنابوں کی مدد سے ایک طرف بکائن اور دوسری طرف روشن دان کی سلاخوں سے بندھی ہوئی چادر کو پھڑ پھڑا رہی تھی، مفت کی دف بجا رہی تھی۔ چادر کے نیچے رسیوں کے ساتھ ساتھ بندھی ہوئی کاٹھ کی چڑیاں لہراتی ہوئی چوں چوں کرنے لگیں۔ کچھ دور تنور کے پاس اس کی بھسل میں لیٹے ہوئے ڈبو نے اپنی ٹانگوں میں دبائی ہوئی گردن اٹھائی اور مشکوک انداز میں اس پورے منظر کو دیکھنے لگا۔ وہ اب تک بوڑھا اور نحیف ہو چکا تھا۔ نہ زیادہ روشنی برداشت کر سکتا تھا اور نہ شور۔ وہ گانو کے مرد عورتوں کی بے طور حرکتیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اندازے ہی کے ساتھ دشمن پہ بھوں بھوں کرنے لگا۔..........

"میں تو جانتا ہوں، وہ نطفہ.........." حضور سنگھ نے کہنا شروع کیا۔

"دُر.........دُر.........." جنداں حضور سنگھ کو پھٹکارتے ہوئے بولی "سوائے بکتے رہنے کے اور کوئی کام ہی نہیں۔" اور وہ اپنی مردہ بے نور آنکھوں سے اس جمگھٹے کی طرف دیکھنے اور سنسنانے لگی۔ وہ نہ جانتی تھی اب آسمان سے اگلی کون سی بلا نازل ہونے والی ہے؟ چونکہ اس کی آنکھیں دھندلی تھیں اس لیے اپنے مقتول بیٹے کی شکل اور بھی کھل کر اس کے سامنے آ رہی تھی۔

"ٹھہر او بے باہمنا!" نمبردار تارا سنگھ نے پروہت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں لاتا ہوں اس ماں کے یار کو پکڑ کے۔"

"ہاں!" کیسر سنگھ نے حامی بھری.........."اس کی میں بہن کے بیاہ میں جوتے کھاتا پھروں۔"

"ہم سب چلتے ہیں؟" جگو بھی تیار ہو گیا۔

دیوانا بولا.........."اتنے جوتے پڑے اس پر بھی بھاگ گیا۔"

گویا اس سے پہلے اسے "ٹھیک کرنے" "سیدھے راستے پر لانے" کے سلسلے میں

کے لوگ اس سے "ٹیڑھے" ہو چکے تھے۔ وہ تو چاہتے تھے اس کی ایک آدھ ٹانگ ہی توڑ دی جائے تاکہ چادر کے نیچے آکر بیٹھے تو پھر ہل ہی نہ سکے۔ چھے سات آدمی ہاتھ میں لٹھیں اور گنڈاسے لیے ہوئے باہر لپکے اور گیان چند سرپنچ، قانون کا سرسری محافظ، صرف دکھاوے کے لیے منع کرتا، شور مچاتا ہوا سب سے پیچھے .... وہاں صرف عورتیں ہی رہ گئیں جن میں سُرما دائی بھی تھی جو منگل کو اس دنیا میں لائی تھی۔

مردوں کو یوں نکلتے دیکھ کر رانو داویلا کرنے لگی .... "چھوڑ دو .... ہائی! مجھے چھوڑ دو، میں نہیں بچوں گی۔" اور یہ سب ٹھیک ہی معلوم ہو رہا تھا۔ رانو پیچھے کی طرف گری اور بیہوش ہو گئی۔ عورتیں اسی شادی کے لیے رکھے ہوئے گھڑوں میں سے پانی انڈیل انڈیل کر رانو کے منہ پر چھینٹے دیتے، اسے ہوش میں لانے لگیں۔ گویا وہ کہہ رہی تھیں، اس نے موت دیکھی ہے تو اب شادی بھی دیکھے ....

منگل کو لوگوں نے فارم کی ساتویں کپاس میں جا پکڑا۔ وہ پہلے ہی بہت سی مار کھا چکنے کے بعد نڈھال ہو چکا تھا۔ اب دہشت سے اور بھی نیم جان ہو گیا۔ وہ چاہتا تو اکالے کر ہمیشہ کی طرح سترلہ یا ستو کی طرف نکل جاتا لیکن شومئی قسمت "اس مرزے کی بکی کو بھی استہزا کی صاحبان نے "ڈھنگ" دیا تھا۔ بکی اپنی بندھی ہوئی اگاڑی کے ساتھ کچھ فاصلے پر کھڑی ہری ہری چری اور موٹھ کھا رہی تھی اور موقع پڑنے پر ساتھ والے کھیت میں لہلہاتی ہوئی گوار کو بھی منہ مار لیتی۔ گانو والوں نے ممکنات کا خیال رکھتے ہوئے بکی کے پانو میں لوہے کا یہ بڑا، موٹا سا سنگل ڈال دیا تھا اور اس پر علی گڑھ کا تالا .... اور اب وہ بے فکر ہو چکے تھے۔

منگل کا خیال تھا اس کے یار غار .... نواب، اسماعیل، اور گورداس وغیرہ اسے اس سانحے سے بچائیں گے لیکن اسے کیا معلوم کہ وہ بے غیرت بھی کوٹلے کے باقی لوگوں کے ساتھ مل جائیں گے اور بار بار یہی کہیں گے .... "آخر عورت ہی کی بات ہے نا میار! کوئی

منگل جہاں چھپا تھا وہاں سے دو ہاتھ دور خانقاہ والا کنواں تھا جہاں آج سے چند ہی برس پہلے منگل کے بڑے بھائی تلو کے کا قتل ہوا تھا۔ جب شام کے وقت سے سے پہلے ہی گھپ اندھیرا ہو گیا تھا اور ایک دن پہلے سورج نے زمین کی بکائن پر خون کے چھینٹے پھینک دیے تھے.........اس مٹی سے اب بھی خون کی بو آ رہی تھی.........

منگل کپاس کے بغل میں ایک تنگ و تاریک "کوٹھ" میں بیٹھا شک اور وسوسے میں بٹا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے باہر دیکھ رہا تھا جب گانو کے لوگ پہنچ گئے.........سردیوں کے موسم میں کبھی کبھی، کوٹلے گانو میں کوئی بھیڑیا یا جنگلی سور آ نکلتا تھا اور لوگ اسی طرح لاٹھیاں اور چھریاں، ٹوکے اور گنڈاسے لے کر اسے گھیرنے، مارنے کے لیے نکل جاتے تھے.........اور آخر اسی وقت دم لیتے جب گھرے ہوئے جانور کے پرخچے اڑ جاتے۔

لوگ آ کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ منگل کوٹھڑی میں دو ہاتھوں کے بل جھکا دہشت کے عالم میں سب کو دیکھتا ہوا، سچ مچ ایک جنگلی سور معلوم ہو رہا تھا۔ وہ نہتا تھا اور باقی سب کے سب مسلح۔ کہاں تو لوگوں نے شور سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا اور کہاں وہ اب آ کر سامنے کھڑے ایکا ایکی چپ ہو گئے تھے، ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے گھور رہے تھے.........دیکھیں پہلا وار کون کرتا ہے؟ شکار کس طرف لپکتا ہے......؟

منگل کا نرخرہ کانپنے لگا اور لوگوں کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد منگل نے ذرا سی جنبش کی۔ لوگوں نے ایک دم خائف ہو کر خالی زمین ہی پہ لاٹھیاں برسانی اور ٹوکے چلانے شروع کر دیے.........ایک شدید ڈر نے ان میں ایسا جوش، ایسی طاقت بھر دی کہ زمین میں بڑے بڑے شگاف ہو گئے۔

ایک بار پھر وہ ایکا ایکی چپ، ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ شکار اور شکاری! منگل کے اپنے دوست، اپنے ساتھی، اکے والے گورداس نے جی کڑا کیا اور آگے بڑھتے ہوئے بولا.........."دیکھتا ہوں یار، کون سا جگا ہے؟"

گوردداس کے بڑھنے کی دیر تھی کہ کیسر سنگھ، جگو، نواب، اسماعیل، سب جھپٹ پڑے۔ ان کے جھپٹنے کی دیر تھی کہ منگل نرغے میں سے نکلنے کے لیے لپکا۔ پھر متداول' ہراول اور قلب سب طرف سے لوگوں نے اسے آلیا جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، لاٹھی، جس کے ہاتھ میں جوتا تھا جوتا، منگل پر برسانے لگا۔ اگر وہ کچھ کرتا تو گنڈاسے اور نوکے بھی تھے..........

شور شرابہ سن کر رلو گیر جمع ہو گئے.......... منگل کو بالوں سے پکڑ کر بیچ کھیتوں اور کھلیانوں کے گھسیٹا جا رہا تھا۔ سکھ ہونے کے ناتے نمبردار تارا سنگھ کیسر سنگھ کا فرض تھا کہ بالوں کو بے حرمتی سے بچاتے لیکن یہ کسب کرنے میں وہی پیش پیش تھے اور اس میں ایک مزا اور انتقام لے رہے تھے۔ گھسیٹے جانے کی اذیت سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے منگل کچھ دور تک اپنی مرضی سے ساتھ چل لیتا، لیکن پھر پیچھے کی طرف کھینچنے لگتا جیسے کسی اڑیل ٹٹو کو پانی پلانے لے جا رہے ہوں.......... اس کے بدن، پھٹے ہوئے کپڑوں، لمبے لمبے کیسوں اور داڑھی میں دھر کونے کی جھاڑیاں، کپاس کی سن چھٹیاں، مکئی کے ٹانڈے، خشک آک میں سے اڑنے والی بڈھی مائیاں اور نہ جانے کیا کچھ گھسٹتا آرہا تھا۔

جوہڑ اور دھرم شالہ کے بیچ تک پہنچتے پہنچتے یہ جلوس خاصا بڑا ہو گیا۔ مسافر سڑک کے ایک طرف رک کر حیرانی سے دیکھنے لگے۔ کیکر کی باڑ کے پیچھے سے اچک کر ایک رلو گیر عورت نے گانو کی ایک مٹیار لڑکی سے پوچھا۔

"ہائے ہائے نی سلکھو.......... یہ کیا ہو رہا ہے؟"

سلکھو نے عورت کی طرف اس نظر سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو.......... ہو ہائے بے بے! اتنی سیانی ہو کے تو یہ بھی نہیں جانتی؟" اور بولی.......... "شادی!" اور پھر وہ لوٹ کر یوں دیکھنے لگی جیسے کوئی بات ہی نہیں۔

کوٹلے سے دور ویشنو دیوی کے پہاڑ کا خاکہ اب بھی دھندلا سا نظر آ رہا تھا.........
اس وقت ضرور وہاں بے شمار جاتری پہاڑ کی پرکرما کرتے ہوئے جا رہے ہوں گے کیونکہ اسی پورنیا کو ویشنو دیوی میں جاتریوں کا اکٹھ تھا وہ ضرور ڈھولکیاں، چھینے بجاتے ہوئے گا رہے ہوں گے.......... بچانا ہے تو بچالو، امباجی! پاپیوں کے بچانے کی یہی بیلا ہے.......... گاتے بجاتے ہوئے انھوں نے ضرور دلھن کی طرف دیکھا ہوگا اور ضرور.......... ان کی نظریں کوٹلہ گانو کے دھندلکے، اندھیارے سے ٹکرا کر لوٹ گئی ہوں گی..........

گاؤں کے باہر یہی ایک نشیب تھا جو سرپنچ گیان چند اور اس کے مزدوروں سے پٹنا رہ گیا تھا جس میں منگل.......... مار کھاتا ہوا منگل، بے سدھ ہو کر گر گیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں بڑی بڑی کسیوں اور کدالوں سے کھدائی کر کے جوہڑ کے پانی کو اندر لایا جاتا تھا اور پھر مٹی کی گول گول ٹنڈوں کی مدد سے اوپر جہلم ارائین کی کیاریوں کی آبیاری کی جاتی تھی جس کی وجہ سے اس کی کھیتیاں سدابہار رہتی تھیں۔ پھر ان پر پھروانہہ کی سنسناتی ہوئی چھانو جس میں بے شمار مسافر سستا چکے تھے.......... اس وقت کچھ دنوں کے لیے بند باندھ کر پانی کو روک دیا گیا تھا لیکن منگل کے چاروں شانے چت اس میں گرنے سے بند ٹوٹ گیا اور جوہڑ کے پانی کے لیے راستہ بن گیا اور پانی تیزی کے ساتھ اندر آنے لگا۔ اس سے پہلے کہ لوگ منگل کو اٹھاتے اس کے کپڑے پانی سے گیلے اور منہ کیچ میں لت پت ہو چکا تھا۔ منگل نے کئی بار اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن آٹھ دس مضبوط بازوؤں کی جوڑیاں اپنے اردگرد پا کر وہ شرابی کی طرح بنکارتا ہوا راستے پر ہو لیا۔

عجیب سا دولھا تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور سر پر پگڑی ندارد.......... ہاتھ میں کندسی کرپان، سہروں کی جگہ جھاڑیاں اور کانٹے، کیسر کے چھینٹوں کی جگہ کیچ کے لودے، آنکھوں میں محبت کے نشے کی بجائے نفرت، ندامت اور ہزیمت کے آنسو اور گدلا پن

مالائیں، اور سانپ، منہ میں دھتورہ اور بھانگ، کمر میں لنگوٹ اور کاندھے پر مرگ چھالا اور ہاتھوں میں ترشول .... براتی بندر اور لنگور، شیر اور چیتے اور ہاتھی .... اس پہ شہنائی کے بجائے ایک عجیب طرح کی کاہش اور خواہش، وحشت اور شہوت پیدا کرنے والی کتا مکھی کی بھنبھناہٹ اور آٹے کی مشین کی کو.......... کو.......... کو.......... کو!

جب منگل کو رانو کے ساتھ بٹھایا گیا تو وہ لہولہان تھا اور رانو مکمل طور پر بیہوش لیکن سب عورتوں کو یقین تھا، آخر میں سب ٹھیک ہو جائے گا.......... اگرچہ چادر کی رسم معمولی ہوتی ہے اور اس میں بہت کچھ نہیں کیا جاتا لیکن یہاں چنوں اور پورن دئی اور ودیا اور لکی اور چنڈی نے مل کر ایک پوری شادی کا سامان کر دیا تھا.......... ورنہ وہ سب ضائع ہو جاتا...... لڑکا عام طور پر لڑکی کے یہاں جا کر اسے بیاہ کر لاتا ہے لیکن اس وقت لڑکی کا مائیکہ بھی یہیں تھا اور سسرال بھی یہیں.......... آگا بھی یہیں پیچھا بھی یہیں..........
پورن دئی باہمی، ودیا اور کچھ دوسری عورتیں لڑکی کے ماں باپ.......... مائیکے کی طرف سے ہو گئیں۔ جنداں چنوں، سردپو، چنڈی اور سُرماسسرال کی طرف سے۔ سب ایک دوسرے کی سدھنیں بنی، آمنے سامنے صف آرا ہو گئیں جیسے کوئی لڑائی لڑنے جا رہی ہوں۔ ماں کی حیثیت سے جنداں نے اپنے تقریباً پوپلے سے منہ کو جنبش دی اور "گھوڑی" گانا شروع کی..........

ارے بنے!
چھوٹی چھوٹی بوندنیاں مینہ برس رہا ہے
سہاگن ماں تیرے شگن منا رہی ہے

اور پھر اس نے ہاتھ اونچا کر کے چنوں، سردپو اور سرما وغیرہ کی طرف اشارہ کیا جو ایک ہی ساتھ شروع ہو گئیں..........

بہن سہاگن تیری گھوڑی کی باگ پکڑے ہوئے ہے بنے!..........

بھابی سہاگن سرمہ ڈال رہی ہے
اور باپ تیرا، زر کی تھیلی کا منہ کھولے کھڑا ہے!

اسی وقت بڑی، بھائیوں کی قطار لیے چھت پہ چلی آئی۔ چھوٹا چموں پیچھے آنے اور باجا سننے پر مچل رہا تھا۔ بڑی اسے منع کرتی، مارتی رہی لیکن اس کا اپنا جی وہ سب کچھ دیکھنے سننے کو چاہ رہا تھا۔ چنوں موسی کے ہاں سے نکلنے، کوٹھے پر آنے کی دیر تھی کہ سب ہی پیچھے آ گئے اور منڈیر پر کھڑے ہو کر اپنی ماں کی شادی دیکھنے لگے۔ بڑی پہلے آٹھ آٹھ آنسو روئی اور پھر وہاں کا رنگ دیکھ کر ایک بچی کی طرح سب کچھ بھول کر، نیچے کی طرف سرکنے لگی۔ وڈیا نے چلا کر کہا "ایو............ گاتی کیوں نہیں ہو؟" اس پہ سب نے اپنی اپنی آواز بلند کر دی۔ تارا سنگھ، گیان چند، دیوانا، کیسر سنگھ، جگو، رلدو، ڈلا اور جمالا اور گانو کے مصلی جو کچھ دور کھڑے چور آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، ایک دم بول اٹھے............ "گاؤ!............ گاؤنا"...... اتنے میں رانو کو ہوش آ گیا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیا مرد اور کیا عورت سب کو دیکھنے لگی، جیسا کہ دلھن کبھی نہیں کرتی۔ وڈیا نے گیت اٹھایا اور پھر باقی بھی سب کی سب شامل ہو گئیں۔

پہلی پہلی وال تیری گھوڑی چڑھے
اور میر ابنا............ لپک کر گھوڑی پر سوار ہو
اور چھوٹی سی بنّو کو لے کے محلوں میں آئے

اور پھر منظر لڑکی والیوں کے ہاں پہنچ گیا۔ پورن دئی نے سہاگ شروع کیے رانی کے باپ کو خطاب کرتے ہوئے۔

بابل! تجھے نیند پیاری ہے
بارے! گھر میں کنّیا کنواری ہے
سندر بیٹی تیری بر مانگتی ہے، ور مانگتی ہے، اچھا سا گھر مانگتی ہے

اوپر کسی نے منہ پر مٹھی گول کر کے باجے کی آواز نکال دی۔ بس پھر کیا تھا سب سمجھ گئے۔ برات آگئی۔ خوب ہی دھاچوکڑی مچی۔ گانو کے سب بوڑھے، بچے، مرد عورتیں سامنے کے کھلے میدان میں، کنویں کے من پر، کوٹھوں کی چھت پر، درختوں کے اوپر، یہاں وہاں سب جگہ پہنچ کر بیٹھ گئے۔ پورن دئی اور اس کی طرار ساتھن وڈیا نے برات کی طرف اشارہ کر کے آئے ہوئے مہمانوں کو بندر، سور بھڑدے اور جانے کیا کچھ کہا اور ایسا کرنے میں ہاتھ اپنے اپنے مردوں کی طرف اٹھا دیئے جس پر خوب ہی کھلی پڑی.........
سمدھیاں ناچیں، ڈومنیاں تھرکیں .... جب ہی پورن دئی نے اپنی بانہہ اُلاری اور وہ نظارہ گانو کے لوگ آج تک نہیں بھولے حتیٰ چولی کے نیچے سے پورو کی ولایتی انگیا نے آنکھیں ماری تھیں۔ پھر اس نے وڈیا کے ساتھ مل کر کئی نمکین اور مرچیلی سٹھنیاں دی تھیں۔

پودینے کی کروکڑاہی رے
منگل کی ماں، رنڈی کی بیٹی آئی رے
ہمارا اچھا کرارا پودینہ!

اس پر نواب کی بیوی عائشہ، جہلم ارائین اور اس کی تینوں بیٹیاں عائشہ، عنایتی اور سلامتی بھی شامل ہو گئیں جیسے پودینہ صرف انہی کی ملک تھی .... اور سب ناچ ناچ اٹھیں ....

ہمارا اچھا کرارا پودینہ!
مسالوں والا پودینہ!
منگل کی بہن تھانے داروں سے چھڑائی رے
پودینے کی کروکڑاہی رے ....

پھر ہنسی کھیل، کلکاریاں جن میں مرد بھی شامل ہو گئے .... بچے بھی اور

بوڑھے بھی.......... کون کس کی چوٹی کھینچ رہا تھا اور کون کس کو کلاوے میں لے رہا تھا، یہ کسی کو پتا نہ چلا۔ پورن دئی جمالے کی بانہوں میں پڑی تھی اور وہیں مچل مچل گئی۔ وڈیا سر و پو کو لپٹ لپٹ رہی تھی.......... بڑی نیچے آکر جو کھڑی ہوئی تو اسے کسی طرف سے دھکا پڑا اور آنکھ گیان چند کی جانگھوں میں جا کھلی جو اسے بڑے پیار، بڑی ہی شفقت سے بھینچ رہا تھا۔

جب ہی چادر کھنچی اور شادی ہو گئی.......... ایکا ایکی سب خاموش کھڑے ہو گئے، کیونکہ ڈولی رخصت ہونے کا سمے آگیا تھا میکے والیوں نے گانا شروع کر دیا۔

بابل! اب تیرا کیا دعوا ہے؟

دولھا کا باپ ڈولی کی متیاں پکڑے کھڑا ہے، اب دعوا اس کا!

بھیا! تیرا اب کیا دعوا ہے

دولھا کا بھائی ڈولی کے بازو تھامے کھڑا ہے، اب دعوا اس کا!

اور پھر ایک.......... واحد بین لڑکی کا..........

بابل!.......... طاقچوں میں میری گڑیاں بکھری ہیں لیکن مجھے کھیلنے کا چاؤ نہیں

بابل! انگنے سہیلیاں یہاں وہاں سے مجھے ملنے آئی ہیں لیکن مجھے ان سے بھی ملنے کا چاؤ نہیں!

.... ہائے روتی ماں کی انگیا بھیگ گئی اور باپ تو دریا رو رہا ہے.......... پھر منہ دکھائی اور جگ ہنسائی.......... آخر سر جوڑی!

پہلے رانو کو اور پھر منگل کو پکڑ کر کوٹھری میں دھکیلتے ہوئے باہر سے تالا لگا دیا گیا جسے چنوں، دونوں جڑواں بھائی اور بڑی دیکھ رہے تھے اور اپنی آنکھیں جھپک رہے تھے......

(۷)

اس رات رانو ایک بہن بیوی اور ماں کی طرح منگل کے زخموں پر سینک کرتی رہی۔ باہر تو جا نہ سکتی تھی اس لیے وہیں دوپٹے کو منہ میں ٹھونس کر وہ اس میں اپنے گرم گرم سانس کی دھونکنی چلاتی اور منگل کی سوجن پہ رکھ دیتی۔ اسے آرام بھی آ رہا تھا اور بیچ بیچ میں وہ کراہ بھی رہا تھا۔ کبھی کبھی درد بغیر پتا دیے، بنا خبردار کیے شعور کی تہوں میں کہیں گم ہو جاتا تو منگل کو رانو کے ہاتھ عجیب سے لگنے لگتے۔ شاید ان ہاتھوں میں رچی ہوئی مہندی کا رنگ اس اندھیرے سے بھی تیکھا تھا اور بو اس کھٹے سے بھی تیز جو سردی اور گرمی کے ملاپ میں ایک دم مہک اٹھتا ہے اور پھر دل میں ایک عجیب طرح کی ان کہی، آنکھ میں عجیب طرح کے ان بہے چھوڑ کر، چند ہی دنوں میں پت جھڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔

رانو یکسر بھول چکی تھی اس کے بچے کہاں ہیں؟ کیسے سوئے ہیں؟ ان میں سے کسی نے کچھ پیٹ میں ڈالا بھی ہے یا نہیں؟ ایک بار چنوں کی شبیہہ لپک کر اس کی سوچ میں آئی اور پھر ویسے ہی، اپنے آپ چلی گئی۔ یہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ چنوں سے کہیں بالا تھا۔ چنوں اور اس کے ساتھ کے لاکھوں کروڑوں بالک اس کا ایک حصہ تھے اور بس کبھی بیچ میں منگل بدک کر پہلو موڑ لیتا تھا۔ پھر رانو ایک طرف جا کر بیٹھ جاتی اور دبی دبی سسکیاں لینے لگتی جو تخلیق سے پہلے ہر عورت کا مقدر ہوتی ہیں۔ ایکا ایکی اسے پیاس لگی لیکن کھڑکی کھول کر کسی کو پانی کے لیے کہنے کی ہمت نہ ہوئی............ پھر منگل بھی اٹھ کر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایکا ایکی اس پر کوئی پاگل پن کا چکر آیا اور دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنا

رہا سہا کرتا بھی پھاڑ ڈالا............ "میں مر گئی" رانو چلائی اور اس کے پاس چلی آئی

"پرے ہٹ جا" منگل نے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

...... پچھلی رات رانو نے منگل کے پانو پکڑ لیے اور ان پر سر رکھتی، روتی ہوئی بولی

"تو تو جانتا ہے منگلا، اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

منگل جو اَب تک مضمحل ہو چکا تھا بولا............ "جانتا ہوں" اور پھر نہ جانے کس جذبے سے اس نے رانو کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اندھیرے میں مسلسل دیکھتے رہنے سے اسے پتا پتا سوئی سوئی دکھائی دینے لگی تھی............

رانو نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہنے دیا اور دھڑکتے ہوئے دل سے انتظار کرنے، دیکھنے لگی، اس کی تقدیر کا ساتھی، اگلے لمحے، اس منہدی رچے ہاتھ کو اپنے کرخت چھانٹے والے ہاتھوں میں رہنے دیتا ہے، یا جھٹک دیتا ہے؟ لیکن ایسا تو کچھ بھی نہ ہوا۔ منگل کا ہاتھ جیسے اپنے آپ نیچے گر گیا اور ساتھ رانو کا بھی............ باہر لوگ ہمیشہ کی طرح یہی سمجھتے رہے............ شادی ایک مسلسل شب زفاف کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کچھ لوگ تو سرے ہی سے نہ جانتے تھے اور جو جانتے تھے ان لمحوں کو بھول چکے تھے جو ان پر بھی آئے تھے جو تپیدگی اور ہیجان اور اہتزاز دو دلوں کے بیچ پیدا ہوا تھا............ شب زفاف کی لذت اس کے مقابلے پہ ایسی ہی تھی جیسے کوئی مفروضہ حاتم سے مہریں مانگنے جائے۔ اپنے ساتھ پوری انسانیت اور اس کے وقار کو اس کے قدموں پہ جا گرائے اور اس کے عوض میں ایک دمڑی پائے............ اس پر بھی دعائیں دیتا ہوا گھر چلا آئے............

صبح جب رانو اور منگل جاگے تو کسی نے تالا کھول دیا تھا۔ منگل اٹھا۔ اس نے چلنے کی کوشش کی لیکن دو ہی قدم کے بعد کراہتا ہوا لوٹ آیا اور روتے ہوئے اپنے عروسی بستر پہ گر گیا۔ رانو بھاگ کر باہر پہنچی اور جا کر ماں جنداں کے پاس کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہے بہو؟" جنداں بولی۔

اس پر رانو نے کہا "بھنڈارے کی چابی دو ماں"

"وہ کس لیے؟"

"ہلدی نکالنا ہے، اسے بہت مار لگی ہے۔"

جنداں نے اپنے دوپٹے کو پلو سے چابیاں کھول کر رانوں کو دے دیں، بھنڈارے کی طرف جانے کی بجائے رانو برآمدے کی طرف لپکی جہاں بچے آدھے، ننگے، آدھے ڈھکے ہوئے سو رہے تھے۔ رانی نے باری باری سب کا منہ چوما اور ان کے بازوؤں، ٹانگوں میں اڑی ہوئی چادریں کھینچ کھینچ کر ان کے جسموں کو ڈھانپا۔ گلابی سی سردی سے ہاتھ رانو میں دیے، سکڑے ہوئے بچے ایک تسکین کے احساس سے سیدھے ہونا شروع ہوئے لیکن جب رانی بڑی کے پاس پہنچی تو وہ جاگ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ رانو اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی، بڑی نے اپنے بڑے بڑے ناخنوں سے ماں کا منہ نوچ لیا اور بولی .... "جا تو ...... اسی سے منہ کالا کرو لے"

رانو پر پہلے کیا کم گزری تھی کہ اس پر بیٹی نے بھی منہ نوچ لیا! وہ تو بڑی کو یہ بھی نہ کہہ سکتی تھی .... بیٹی! تیرے ہی لیے تو میں نے یہ سب کیا ہے اور تو اور تو بھی؟ لیکن اس کے پاس یہ سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی؟ وہ تو یہ بھی نہ سوچ سکتی تھی .... اس کی بیٹی، اس کی اپنی جسے اس نے نو مہینے پیٹ میں رکھا، ہزار اذیتیں سہہ کر آخر ایک دن جانکاہی کے عالم میں اس دنیا میں لائی، بے بسی اور میلے سے دھوتی روتی ہوئی پالا، بڑا کیا اور اب بڑی ہو کر اس نے منہ نہیں نوچا .... پھول برسائے ہیں! رانی ایک کند اور خالی ذہن کے ساتھ اندر ہلدی لینے کے لیے چلی گئی جسے نکال کر اس میں تیل ڈال کر، توے پہ پکایا اور پھر منگل کی چوٹوں پر باندھنے کے لیے لے چلی .... اندر پہنچی تو منگل وہاں نہ تھا۔ شاید جب رانو اپنی ساس کے پاس تھی وہ کہیں نکل گیا تھا۔ رانو دوڑ کر باہر دروازے تک گئی ...... منگل کا کہیں سایہ تک نظر نہ آیا۔ البتہ ڈبو پاس آکر دم ہلانے، چوں چوں کرنے لگا

اور اگلے پنجے اٹھا اٹھا کر رانو پہ رکھے جیسے کہہ رہا ہو...... میں جانتا ہوں رانی! تیرے ساتھ کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہو جائے گا، آخر سب ٹھیک ہو جائے گا............

چنوں روز سویرے مندر جایا کرتی تھی اور صبح کی دودھیا خنکی پہ اس کی آواز پیری ہوئی آیا کرتی "مکاں تیں رام نہ جانیا رے"............ لیکن آج مندر جانے کی بجائے وہ سیدھی رانو کے ہاں چلی آئی۔ رانی بھی اسے دروازے میں کھڑی مل گئی، چھوٹتے ہی چنوں نے پوچھا۔

"کیوں رانی؟ سب سکھ ہے نا؟"

رانی چپ رہی۔

"بول نا" چنوں پوچھنے لگی۔ اس پر بھی جب رانی کچھ نہ بولی تو چنوں نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا "بول، رات کچھ ہوا؟............ ہائے کیسی گھنگھنیاں منہ میں ڈالی ہیں؟"

جو گھنگھنیاں رانو نے منہ میں ڈالی تھیں، ان کے بارے میں کیسے بتاتی؟ اس کے کھولتے پانی کی تپش اور جلن، جن میں اس کے جذبات، ان کی کاشت اور حاصل برداشت کا دانہ دانہ تک اُبل گیا تھا، جل گیا تھا، چنوں کو کن الفاظ میں بیان کرتی؟ نیچے دیکھتی پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ رانی بولی............ "رات کچھ نہیں ہوا"

چنوں نے غور سے رانو کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولی............ "جھوٹ بکتی ہے؟...... تھلا اچھا تیرے منہ پر یہ ناخنوں کے نشان کیسے ہیں؟"

ٹھنڈے پسینے کے قطرے رانو کے چہرے پہ چلے آئے اور وہ کچھ نہ بولی۔ کچھ دیر یوں ہی بیکار، شرمسار سی کھڑی رہنے کے بعد جیسے وہ ایکا ایکی اُبل پڑی۔ "تو جو کہتی ہے چنوں! مجھے اس کی ضرورت نہیں............ میں تو تن ڈھانپنے کے لیے دو کپڑے مانگتی تھی، بھیناں!............ پیٹ میں ڈالنے کے لیے دو روٹیاں............ پتا نہیں واہگورو پرماتما کو کیا منظور ہے؟

دیوی ماں کیا چاہتی ہے؟............ وہ اب پھر چلا گیا ہے کہیں.........."

"ہائے رام!" چنوں نے پیچھے گلی کے اندھیرے کو صاف ہوتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگی "کدھر گیا مُوا، تت پلتا؟" اور پھر ایک دم کسی غلطی کا احساس کرتے ہوئے بولی "میں منہ جلی.......... تیرے سامنے تو اب مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے۔"

رانو مسکرا دی.......... جیسے رو رہی تھی یا رو دی، جیسے مسکرا رہی تھی

چنوں رانو کو دلاسا دیتے ہوئے کہنے لگی۔ "اس کی تو فکر نہ کر رانی! جیسے وہ گیا ہے، بی با! ویسے ہی آ بھی جائے گا۔"

اور دوپہر کے قریب منگل سچ مچ ہی چلا آیا۔ اس نے نواب کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ اسماعیل کا صافہ اور گورداس کا گاہے شاہی جوتا۔ بدن پر پٹیاں بندھی تھیں۔ اس کا خیال تھا گھر کی ہلدی ولدی سے کچھ ہونے ہوانے کا نہیں، اس لیے وہ صبح کے پہلے ہی پھیرے میں اسماعیل کے ساتھ اس کے اکے پر نکل گیا تھا اور ڈسکے کے بڑے اسپتال میں جا کر پٹی کروا آیا تھا.......... صبح سے کچھ پیٹ میں ڈالا تھا یا نہیں، خدا جانے.......... کل سے تو صرف مار کھائی تھی اور یا پھر.......... شادی کی تھی۔

دن بھر منگل کھاٹ بیٹھا زمین کے تنکے گنتا رہا۔ کبھی وزن میں اپنا آپا اسے ایک تنکے سے بھی ہلکا معلوم ہونے لگتا اور کبھی پوری زمین سے بھاری۔ پھر کبھی بیچ میں جھک کر، انگلی سے وہ کچی زمین پہ "اونسیاں"...... قسمت کی لکیریں کھینچنے لگتا لیکن جب انھیں گنتا تو وہ جفت ہی آتیں، کوئی طاق نہ بچتی۔ قسمت کہیں راستہ نہ دیتی۔ جھلا کر ہاتھ پھیلاتے ہوئے اس نے بھاگوں کے سب لیکھ مٹا دیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک اضطراری کیفیت سے چہرہ صاف کیا تو سب دھول منہ پر چلی آئی۔ اپنی طرف سے صفائی کے عمل میں وہ اور بھی گندا تقدیر آلود نظر آنے لگا تھا۔

جب ہی ہاتھ اٹھا اٹھا کر وہ بکائن پر آ کر بیٹھنے والے، کرخت آواز میں کائیں کائیں

کرنے والے ڈھوڈروں.......... پہاڑی کووں کو اڑانے، گانو کے گولی جوگے آوارہ کتوں کو ایک نیم جان، خارش زدہ کتے پر جھپٹنے سے روکنے لگا.......... پھر ایک طرف سے کہیں آدھی درجن کے قریب کتے، ایک دوسرے پر جھپٹتے، غراتے ہوئے چلے آئے جنھیں بھگاتے ہوئے منگل بول اٹھا.......... "میں حیران ہوں یار!.......... کوٹلے میں جو بھی مرتا ہے، شاید کتا ہی بن جاتا ہے.........."

کچی دیوار پر سے دور دھولا دھار اور ہمالہ کے سلسلہ ہائے کوہ کہیں ایک دوسرے میں کھپ گئے تھے اور ان کے بیچ کہیں کہیں برف چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ان پہاڑوں سے ادھر دکھن کا وہ علاقہ تھا جس کی ٹیکریوں پہ پہاڑی کے سوز نے جنم لیا تھا کیونکہ یہاں کے عاشق اور معشوق کبھی آپس میں نہ مل سکے تھے۔ ایک اس ٹیکری پہ ہوتا تو دوسرا اس پر، اور بیچ میں دریا۔

پاپی لوگ پہاڑ دے، پتھر جن کے چت
انگ ملاوا کبھی کبھی، نین ملا وانت

اوران کی جدائیوں کا درد، راوی چناب اور جہلم کے کنارے کنارے ہوتا ہوا وارث شاہ اور قادر یار کے صوت میں سانول اور گنجی بار کے دل تک پہنچ گیا تھا..........

ایک ایک کر کے گزرے ہوئے واقعات منگل کے دماغ میں آنے لگے۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور مرزے کی آواز میں گنگنانے لگا۔ "تو نے برا کیا، صاحباں.......... جو میری بکی کی گاڑی باندھ دی میرے تیر و ترکش ٹانگ دیئے ورنہ ایک تیر سے تیرے بھائیوں کو کھپت کر دیتا اور دوسرے سے اسے جس کی تو منگیتر تھی.........."

لیکن شاید منگل کے فگار دل کے لیے مرزا صاحباں
چنانچہ ایک کان پہ ہاتھ رکھ کر، دوسری بانہہ اُلارتے ہوئے
چھتن شاہ فقیر سے ایک جاٹنی عرض کرتی ہے.......... میں سالم بکرا تیری نیاز گزاروں اگر

میرے سر کا سائیں مر جائے، پانچ سات پڑوسنیں ہلاک ہو جائیں اور جو رہتی ہیں انھیں تپ آ لے۔ گانو کے نمبردار کو پٹکی پڑ لے جو تھانے میں رپٹ کرتا ہے کہ اڑ بیبے........ بیبے کی اٹ جل جائے جہاں ہمیشہ دیا جلتا ہے۔ فقیر کی کتیا مر جائے جو دن رات چوں چوں کرتی رہتی ہے.............. گلیاں سونی ہو جائیں.......... اور میرا محبوب بنا روک ٹوک کے آ سکے......"

یوں جی کو آسودہ کر کے، منگل اندر جا کر لیٹ گیا۔ جب تک فضا میں سے کشت و خون نکل گیا تھا۔ صبحیں، دوپہریں اور شامیں ڈھلنے لگیں، جیسے وہ کوئی میلی دیواریں تھیں اور کوئی آسمان کے دریائے درد سے مشکوں پانی لے کر، کرنوں کی جھاڑو سے انھیں دھوا گال رہا تھا.......... رانو نے کھانا پکایا۔ پھر بھاگ کر چنوں کے ہاں سے تھوڑا سا گھی لے آئی اور ایک بیوی کی طرح اس کی بڑی سی مقدار روٹی پر رکھ دی۔ وہ روٹی پہ "چونگھا" نکالنے ہی والی تھی کہ کسی خیال کے آنے سے رک گئی، شرما گئی اور ہاتھ کھینچ لیا۔

کچھ دیر میں، کھانا ڈالنے کے بعد اس نے بڑی سے کہا "جا اسے دے آ"

بڑی نے ننھے پھلا کر شانے جھٹک دیے اور بولی.............. "میری جائے ہے جوتی۔"

رانو خجل ہو کر خود ہی اٹھنے والی تھی کہ پاس بیٹھا ہوا چھوں بول اٹھا.......... "لا ماں، میں دے آتا ہوں۔"

رانو نے چھوں کی طرف دیکھا.......... جیسے یہ اس کا بچپن تھا، اس کی معصومیت ہی تھی جو رانو کے دکھ کو سمجھ سکتی تھی۔ یہ بچپن اور معصومیت جو کردہ و ناکردہ گناہوں سے کہیں اوپر تھے۔ رانو کا جی چاہا اسے چھاتی سے لگا لے، بھینچ لے، یوں بھینچ لے کہ وہ پھر سے اس کے بدن میں تحلیل ہو جائے اور اس دنیا میں نہ آئے جہاں.......... جب ہی اس نے تھالا چھوں کے آگے سرکا دی اور خود دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے بیٹھ گئی۔

یوں دن بیت گئے۔ مہینے بیت گئے۔ منگل کے دل میں آہستہ آہستہ ایک ذمے داری کا احساس جیسے اپنے آپ پیدا ہونے لگا اور وہ چار چار پانچ پانچ روپے کما کر گھر لانے لگا۔ اگرچہ رانو کے ساتھ اس کا میاں بیوی کا رشتہ نہیں تھا۔ اس پر بھی وہ روپے لا کر ماں کے ہاتھ میں دینے کی بجائے رانو ہی کے ہاتھ میں دیتا اور رانو خوش ہو اٹھتی اور اُداس بھی۔ ڈر سے ملا جلا ایک استحکام کا جذبہ اس کے دل میں جگہ پانے لگا۔ گانو بھر کی عورتیں، کیا چنوں اور کیا پورن دئی کیا وڈیا اور کیا سرو پو سب نے "کچھ ہوانی............نی کچھ ہوا؟" پوچھ پوچھ کر غریب رانو کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ رانو جواب میں صرف اتنا ہی کہتی............"رنڈیو! شکر نہیں کرتیں میرا گھر بس گیا ہے، روٹی کپڑا ملنے لگا ہے مجھے؟ اب مجھے کوئی اس گھر سے نہیں نکالے گا۔ کوئی میری بیٹی کو نہیں بیچے گا............"

لیکن............وہ سب شہد کی مکھیاں یوں ہی چھوڑنے والی تھوڑے تھیں؟ دیر تک وہ رانو کے ارد گرد بھنبھناتی رہتیں اور اس کے کولھوں میں چپے دے دے کر پوچھتیں............"کیا مطلب؟............ساری رات وہ ایسے ہی پڑا رہتا ہے؟"

"ہاں"

"تو ادھر اور وہ اُدھر؟"

"ہاں"

"تو بھی اسے بلانے کی کوشش نہیں کرتی؟"

"نہیں"

"کیوں نہیں............ناس پیٹے؟............وہ تیرا دھنی، شادی کی ہے تیرے ساتھ............چادر ڈالی ہے تجھ پر؟"

رانو رو نکھی ہو اٹھتی اور بول اٹھتی "چادر ڈالی ہے تو کیا ہوا؟............مجھے اب بھی وہ ویسے ہی لگتا ہے جیسے پہلے لگتا تھا............"

اس پر سب ہنکار اٹھتیں .... "ہو ہائے" "پھٹے منہ" "در لعنت" اور پھر وہی "تمھیں نیند کیسے آتی ہے؟"

"جیسے پہلے آتی تھی۔"

"وہ بھی سو جاتا ہے بس......... ایسے ہی؟"

"ہاں"

"رات کو اٹھتا اکڑتا.............. جماہی بھی نہیں لیتا؟"

اس پر سب ہنس پڑتیں اور ایک دوسرے کو "چھیاں" دینے لگتیں اور آخر سمجھاتیں "تو کچھ کر، کشتی جانے کی نہیں تو ہاتھ سے جاتا رہے گا۔"

پورو بیچ میں بول اٹھتی .... "کہو تو تجھے ایک ٹونا لا دوں؟"

"ہاں نی" وڈیا حامی بھرتی۔

"نہیں نہیں" رانو کہتی .... "میں کوئی ٹونا وونا نہ کروں گی۔ تو پھر بیٹھ کے روئے گی۔" پورو تنبیہا کہتی۔

وڈیا معنی خیز انداز میں پورو کی طرف دیکھتے ہوئے بول اٹھتی "تو تو نہیں روتی نا؟"

پورو ایک دم اپنی شرم اور لاج کو ایک طرف رکھتی، اپنی جوتی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کہتی میری روتی ہے یہ .... میں ٹونا نہ لاتی، میرا شمبھو پیدا نہ ہوتا تو یہی چاچا تمھارا مجھے گھر سے نکال دیتا .... "اس پر سب کھلی کپاس کی طرح ہنس ہنس پڑتیں اور پورن کی ایک بڑی سی آنکھ پھیلا کر، سب کو چاروں طرف دکھا کر مارتی۔ تب چنوں پوچھ لیتی ...... "باوا ہری داس کے کے دن رہ گئے؟"

"جب ہی پورن دئی، چنوں کی چوٹی پکڑ کر یوں کھینچی کہ سب .... "میں مر گئی، ہائے مر گئی ...." کے بلو میں ختم ہو جاتا۔

اکثر پوچھتے رہتے............ "کیوں پھر کیسی لگی؟" اور منگل کا چہرہ ایک دم لال ہو اٹھتا۔ اسے یوں معلوم ہونے لگتا جیسے کسی نے اس کی ماں، بہن کے بارے میں کوئی بات بے احتیاطی سے کہہ دی ہو۔ وہ چپ رہتا اور بیکاریکی کے ساز میں بکلس کسنے یا گھوڑی کو تھپکنے لگتا۔ گور داس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہہ اٹھتا

"سچ پوچھو تو دوہاجن[1] کی بڑی موج ہوتی ہے؟"

"موج کیسی؟" نواب لقمہ دیتا............ یا اسماعیل...... یا کوئی اور

"وہ پہلے ہی رسی بسی ہوتی ہے نا؟............ سب جانتی ہے۔"

اس پر سب مل کر ہاہا، ہو ہو کرنے لگتے جس کے بیچ میں منگل کی پاٹ دار آواز آتی

.... "ٹھہرو تمھاری ماں کا............ " اور سب ایکا ایکی چپ ہو کر منگل کی طرف دیکھنے لگتے۔ صرف گورداس ہمت کرتا کیونکہ وہ تن و توش کے اعتبار سے مضبوط تھا اور اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہر کسی کو سوچنا پڑتا تھا۔ وہ کہتا۔ "اسے ماں بنانے کے لیے بیاہ کیا ہے، اوئے چادر ڈالی ہے............؟"

منگل ایک کڑی نگاہ سے اس کی طرف دیکھتا لیکن مصلحت کو بہادری سمجھ کر چپ رہتا۔ تھوڑی دیر میں گدلائی ہوئی فضا صاف ہوتی اور اسماعیل کوئی لطیفہ شروع کر دیتا...... یا کثیفہ............ ایک سردار جی کی اکنی کیچڑ میں گر گئی؟"

"پھر............ پھر کیا ہوا؟" نواب منگل کی طرف دیکھتے، مزا لیتے ہوئے پوچھتا۔ جب بھی بیچ میں کوئی سواری چلی آتی اور نواب اس سے مخاطب ہو جاتا............ کوٹلے چلے گی مائی؟"

"نہیں ویرا" مائی کہتی اور چلی جاتی............ نواب پھر اسماعیل کو پکڑتا۔ "ہاں تو سردار جی کی اکنی کیچڑ میں گر گئی............؟"

---

[1] وہ عورت جس کی دوسری شادی ہو۔

"ہاں" وہ بیان جاری رکھتا "اور وہ کچھا پہنے ہوئے کیچ میں کود پڑے اور لگے اکنی ڈھونڈنے.........اور اوپر ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہتے.........اللہ مل جائے! یا اللہ مل جائے.....
ایک مسلمین پاس سے گزرا۔ اللہ کا نام سن کر ٹھہر گیا اور بولا.........."اوئے سردار! تو ہمارے اللہ سے کیوں کہتا ہے؟ اپنے واہگورو سے کیوں نہیں؟.........سردار جی نے اوپر دیکھا اور بولے.........اونہہ! اکنی کے لیے واہ گورو کو کیچڑ میں ڈالوں؟"

اس پر سب کھلی مار کے ہنس دیتے۔ منگل بھی مسکرا اٹھتا اور اسماعیل اسے اجازت نامہ سمجھ کر اس کے پاس پہنچتا اور کہتا.........."منگلا! یہ ٹھیک ہے، سرداروں کے بارہ بجتے ہیں؟"

"ہاں بجتے ہیں" منگل اقرار کرتا۔

"تیرے بھی بجتے ہیں؟"

"ہاں! میرے بھی بجتے ہیں۔"

"پھر منگل کے جونڈے" پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسماعیل پوچھتا۔

"یہاں کچھ ہوتا ہے؟"

"ہاں ہوتا ہے" منگل پیچھا چھڑانے کے لیے مان لیتا لیکن اسماعیل اسی پر بس نہ کرتا بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتا "سن.........یہ تمھیں دن کے بارہ بجے ہی ہوتا ہے یا رات کے بارہ بجے بھی؟"

"دن کے.........جو اصلی سیکھ ہے اسے تو دن کے بارہ بجے ہی ہوتا ہے......... اتنے بال اور گرمی کتنی پڑتی ہے۔"

"تو پھر.........؟" اسماعیل کہتا۔ "وہ اپنے گانو کا وسا کھا سنگھ ہے نا.........ترکھان .....وہ تو رات کے بارے بجے بہت "کھرُود" کرتا.........شور مچاتا ہے"

منگل جواب دیتا........."وہ [illegible]

اور سب مل کر ہنسنے لگتے۔ منگل کی آواز سب سے بلند ہوتی۔ پھر بیچ میں کوئی جاترن چلی آتی اور سب مل کر اسے لپک لیتے۔ اس کی گٹھری نواب کے اکے میں ہوتی' جوتے منگل کے اکے میں اور وہ خود گورداس کی بانہوں میں۔ اکثر ایسا ہوتا میاں ایک اکے میں ہوتا اور بیوی دوسرے میں اور بچہ تیسرے میں۔ بہت ہی گالی گلوچ کے بعد سب مل کر کسی ایک کا اکا بھر کر روانہ کر دیتے اور خود دوسری سواریوں کے پیچھے بھاگنے لگتے۔ منگل کو اب عورتوں میں صرف سواری کی حد تک دلچسپی تھی۔ وہ کبھی کسی نوجوان لڑکی کو دیکھتا بھی تو ایک سرسری نظر سے......... جیسے کہہ رہا ہو، ہاں ایسی بھی ہوتی ہیں......... سلامتے میں اسے اب بھی دلچسپی تھی۔ اس لڑکی کو عورتوں کی ڈاک سے پتا چل گیا تھا کہ منگل اور اس کی بیوی میں ابھی تک کچھ وہ نہیں ہوا......... وہ اور بن سنور کر اس کے سامنے آتی اور سیر دں کے اشارے کرتی لیکن اندر سے وہ جلی بیٹھی تھی۔ اس نے فیصلہ کر رکھا تھا۔ ایک دن منگل کو اپنے چنگل میں پھنساؤں گی......... ڈھارے کے پیچھے کپڑے اتر واؤں گی اور جب وہ ہاتھ بڑھائے گا تو شور مچادوں گی اور اس کی وہ بے عزتی کراؤں گی کہ یاد ہی کرے......... اب جب کہ وہ بیوی والا ہو چکا ہے، اس کا منہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کالا ہو جائے گا.........

اس دن نصیبوں والے اڈے پہ منگل نے نواب کے ساتھ پی لی......... لیکن ڈرتے ڈرتے۔ اپنے بھائی کے زمانے میں تو وہ بوتلیں لنڈھایا کرتا تھا لیکن اب وہ ڈرتا تھا۔ اسے پینے کی خواہش تھی لیکن یوں بے تکے پن سے نہیں۔

رانو بھی عام عورتوں کی طرح تھی جو شادی کے پہلے ہی روز سے اپنے شوہروں کے چہرے دیکھنا سیکھ جاتی ہیں۔ اس پر آنے والے ایک ایک شکن کو جاننے پہچاننے لگتی ہیں جب ان کا مرد کوئی گناہ کر کے آتا ہے تو انھیں لامحالہ پتا چل جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کچھ نہیں کہتیں۔ باتیں کرنے میں وہ ان کی زیر زبر دیکھ لیتی ہیں بلکہ چوکھٹ کے اندر پہلا ہی قدم ان کی پوری جانتک، پوری الف لیلیٰ ان کے سامنے دہرا دیتا ہے......... اس سے

پہلے بھی منگل نے دو چار بار پی لی تھی اور وہ جان گئی تھی............ منگل کو بھی معلوم تھا کہ وہ جان گئی ہے............ لیکن اس پر بھی خاموشی کا پردہ پڑا رہا اور ایسے ہی نبھتی رہی..........

جوں جوں دن بیتنے لگے، گانو کی عورتیں، رانو کو ڈانٹنے ڈپٹنے لگیں اور سوچنے لگی شاید یہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں............ وہ ڈرنے لگی، اپنے مستقبل سے، اپنے بچوں کے مستقبل سے کیونکہ بیچ بیچ میں منگل الف ہو اٹھتا تھا...... "ہٹاؤ یہ سب............ کیا تماشہ بنا رکھا ہے۔" اور رانو کانپ جاتی۔ وہ منگل کو کچھ بھی تو نہ کہہ سکتی تھی۔ اس پر اس کا حق ہی کیا تھا؟...... نہیں نہیں، حق تو تھا............ پنچایت کی موجودگی میں گانو کے سب مرد عورتوں کی گواہی میں، اس نے مجھ پر چادر ڈالی تھی............ سوچیں تو حق ہے بھی اور نہیں بھی۔ چادر کا کیا ہے؟............ اڑھائی تین گز کا کپڑا............ ایسا کہیں تو شادی کے پھیرے بھی کیا ہیں؟ یہ سب ٹھیک ہے۔ نہیں، کچھ بھی ٹھیک نہیں............ تلوکا بھی تو تھا اس سے وہ اتنی خائف نہ رہا کرتی تھی۔ جو منہ میں آتا دھڑ سے کہہ ڈالتی۔ چاہے بعد میں مار ہی کھاتی۔ میں اسے کیوں نہیں کچھ بھی کہہ سکتی............؟ منگل رانو پر انگلی بھی نہ اٹھاتا تھا۔ سوائے رات کے، اس جگہ پر کھڑا بھی نہ ہوتا جہاں رانو کی پرچھائیں پڑتیں۔ پھر بھی............ اس کا کیا مطلب؟............ چلو اچھا ہی ہے، مار تو نہیں پڑتی۔ ہڈیوں کو سینک تو نہیں کرنا پڑتا لیکن .... بہت دنوں تک سوچتے رہنے کے بعد رانو سمجھ گئی کہ وہ منگل کو کیوں کچھ نہیں کہہ سکتی؟ دوسری عورتیں جو اناپ شناپ منہ میں آئے بک دیتی ہیں۔ دن چھلا، رات زیور کچھ نہ کچھ مانگتی ہی رہتی ہیں اور اسے لا کے دینا پڑتا ہے............

آج دن کچھ اندر باہر تھا جب منگل قصبے سے لوٹا۔ سورج کی روشنی ابھی آسمان پر ہونے سے اشٹم کا بے نور چاند سفید سی پتنگ کی طرح ایک کیکر میں الجھا ہوا تھا اور اب اکے کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا ساہنسیوں کی ٹھٹی کے اوپر، آسمان کے کھلے میدان میں جا کر ساکت ہو گیا جہاں منگل اپنا اکا رکھ دیا کرتا تھا اور ٹٹو کو تھوڑا چارہ دارہ ڈال کر گھر چلا

آتا...... پھر لوٹ آنے، اسے کھر یرا کرنے اور دانہ ڈالنے کے لیے......... باقی کا کام اگلی سویر پر ملتوی.........

اکا اور یکی کا بندوبست کرنے کے بعد منگل لوٹا جہاں وہ اکا کھڑا کیا کرتا تھا۔ وہاں سے دائیں طرف فارم کی پندرہ پندرہ فٹ اونچی ایکھ کھڑی تھی جس کے بیچ میں سے چیونٹی بھی نہ گزر سکتی تھی۔ البتہ جھینگر، دن بھر اپنی ہی دم میں سے لیس نکال کر ایک تار بناتے اور جھولتے جھلاتے ایک گنے سے دوسرے گنے تک پہنچ جاتے اور پھر اس کے رس میں ڈوب کر اگلے گنے کے پاس......... بائیں طرف مکان شروع ہوتے تھے جن میں سب سے ادھر مدرسہ تھا اور اس کے ساتھ والا مکان جہلم ارائین کا جس کے اُدھر جا کر اب چاند تھم گیا تھا.........

فضا میں سے ایک قسم کی خوشبو آرہی تھی۔ منگل جانتا تھا وہ خوشبو کیسی ہے؟ .... بات یہ تھی گانو کے کسان ہر سال اسی مہینے رس نکالتے، گڑ بناتے اور ایکھ کے بیچ میں تھوڑی سی جگہ خالی کر کے، زمین کھود کے، گڑ سے بھرا ہوا مٹکا اس میں رکھ دیتے اور کیکر کی چھال اس میں ڈال کر اوپر گوبر اور گھوڑے کی لید ڈال دیتے......... کچھ دن میں مٹکا چلنے "بولنے" لگتا اور بڑبڑ کرتی ہوئی شراب مٹکوں سے باہر چلی آتی، ہوا میں بس جاتی .... فضا مکدر ہوا تھتی اور معطر بھی.........

اب بھادوں اسوج میں ڈھل رہا تھا جب کہ گرم ہوا اور لو کے عادی جسم سرد ہوا کا ایک بھی جھونکا برداشت نہیں کر سکتے۔ ایک عجیب طرح کی چبھن اور کاہش انسان کے دل کے اندر پیدا ہونے لگتی ہے نہ آدمی چادر اوڑھ سکتا ہے نہ چھوڑ سکتا ہے......... عورتیں کسی خیالی کپکپی سے اثر پذیر ہو کر سب گودڑ اور روئی اندر سے نکال لاتی ہیں اور پھر دھنیئے کو بلوا اس سے دھنوا، نئے لحافوں میں بھرتی، ان پہ کالے سوت کے "نگندے" ڈالتی، لمبی تان کے سو جاتی ہیں...... سردیوں کے لیے تیار۔ اب ان کے لیے چاہے کہر پڑے یا برف لیکن

مردوں کو ٹھنڈی ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ ایک اذیت ہوتی ہے ان کے جسم ایک دم سیاہ اور سرخ ہو اٹھتے ہیں اور مشام اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر مقابل کے مساموں سے ان گنت بار جفت ہونے کے لیے چل نکلتے ہیں.......... مرد کا پورا جسم ایک پھنئیر سانپ کی طرح پھنکارنے لگتا ہے......

منگل گھر کی طرف قدم اٹھانے ہی والا تھا کہ بائیں طرف چھت پر سے آواز آئی

"منگلا دے"

منگل نے اوپر دیکھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں اشٹم کا چاند آ کر رک گیا تھا.......... سلامتے کھڑی تھی اور اس کے دھندلے سے نقش دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے نقش جو اچھے بھلے آدمی کو پاگل بنا دیتے ہیں کیونکہ وہ پورے نظر نہیں آتے۔ سلامتے نے کہا "ٹھہر دے، مجھے تجھ سے کام ہے۔"

منگل.......... جادو سا کت رہ گیا۔ اسکے بدن میں اس وقت ایک ہی چیز حرکت کر رہی تھی.......... اس کا دل، جس نے تمام تر سکوت کی کسر نکال دی.......... سلامتی ادھر سے آ رہی تھی جس طرف لکڑی کی سیڑھی جہلم کے گھر میں اترنے کی بجائے باہر اترتی تھی جس پر آزادانہ اتر چڑھ کر عنایتی اور سلامتی اور جہلم لال لال مرچیں سوکھنے کے لیے ڈالا کرتیں.......... جتنا آدمی پوری زندگی میں کرتا ہے اتنا منگل نے سلامتی کے کوٹھے پر سے اپنے آپ تک پہنچنے میں سوچ ڈالا۔ سلامتی آ کر منگل سے کچھ دور کھڑی ہو گئی.......... چپ چاپ!

منگل نے پوچھا "کیا بات ہے، سلامتیے۔"

"کچھ نہیں" سلامتی بولی.......... اس کی آواز میں شکایتیں تھیں، حکایتیں تھیں اور آنسو تھے۔ گویا وہ کہہ رہی تھی "تیرے سامنے بیٹھ کے روؤں گی لیکن دکھ تجھے نہیں بتاؤں گی۔"

"بتاتا" منگل نے کچھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

سلامتی تھوڑا پیچھے ہٹ گئی جیسے وہ ڈر گئی تھی..........

"پرے پرے" .... سلامتی بولی۔

..........ایک خوشبو اڑ کر سلامتی کی طرف سے آئی۔ یہ خوشبو گانو کی خوشبوؤں میں سے نہ تھی۔ کیونکہ ان خوشبوؤں میں سے منگل کے مشام پوری طرح سے واقف تھے۔ یہ شہر کی خوشبوؤں میں سے تھی جو محبت کو ایک قسم کی گوارا سی عفونت دے دیتی ہیں بخلاف اس پسینے اور غلاظت کی بدبو کے جو تندرست بدنوں کی ناتمام محبت اور اس کی تب و تاب میں مندل ہو جاتی ہے .... منگل کے دل میں اواخر بھادوں کی ہواؤں سے جو شعلہ ایکا ایکی بھڑک اٹھا تھا۔ اس "پرے پرے" سے اور بھی لپک اٹھا۔ سلامتی کے رکھ رکھاؤ کی پروانہ کرتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور بولا۔

"تو مجھ سے ڈرتی ہے؟"

"ہاں" سلامتی بولی "یاد نہیں اس دن..........؟.........."

"یاد ہے" منگل بولا "پر سب دن ایک سے تھوڑے ہوتے ہیں۔ سلامتیے؟" اور وہ آگے بڑھ گیا۔ سلامتی پیچھے ہٹتی "نہیں نہیں نہیں نہیں" کہتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ اس نے سوچ رکھا تھا منگل کے ہاتھ پکڑتے ہی شور مچا دے گی اور اسے پکڑوا کر اپنی بے عزتی کا بدلہ لے گی۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا۔ اگر یہ ریچھ کا بچہ، اس ایک جست کے فاصلے کو، جو اس کے اور منگل کے بیچ رہ گیا تھا، پار کر کے اسے پکڑ لے اور اس کا منہ بند کر لے یا منہ کو بالوں سے بھرپور چھاتی میں بھینچ لے تو وہ کیا کرے گی؟ اس کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ جائے گی..........اور وہ ریچھ، آہستہ مگر یقیناً اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سلامتی کی آواز گلے میں اٹک گئی..........وہ کانپ رہی تھی اور نہ جانتی تھی منگل پر بھی کوئی لرزہ چھا رہا ہے۔ صرف ایک قدم..........اور سلامتی کے لیے اب سب کچھ ناممکن

العمل ہو گیا تھا۔ دونوں برابر آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں کو تلاش کر رہے تھے دو بلّوں کی طرح اندھیرے میں گھور رہے تھے .... ایسے میں صرف عورت کا دماغ کام کرتا ہے مرد کا نہیں۔ جیسے پھر مرد کا کرتا ہے عورت کا نہیں۔ اس ایک قدم کے فاصلے کو منگل کی بجائے سلامتی نے پاٹ لیا......... اور اچک کر منگل سے چمٹ گئی۔ اس نے من جانے کے انداز سے منگل کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کا جارحانہ عمل روک لیا اور منگل ایک میٹھی سی آواز میں بولا "بولو کیا کام تھا؟"

"کچھ نہیں" سلامتی بولی "سوچا تھا ملے گا تو تجھ سے کہوں گی ...... "اڑیا! جتھے تیرے ہل وگدے، اوتھے لے چل چرکھا میرا۔" اور پھر وہ ہنس دی۔

منگل نے پھر ہاتھ آگے بڑھائے۔ سلامتی بولی "پاگل ہو گیا ہے .... یہ بھی کوئی وقت ہے، جگہ ہے؟"

"نہیں نہیں۔"

"نہیں"

"تو پھر......... کب؟......... کہاں......... ؟"

سلامتی نے اکھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہاں......... جب ادھر مندر میں گھنٹیاں بجیں اور مسجد میں ملا اذان دے........."

منگل نے پہلے اکھ کی طرف دیکھا اور پھر آسمان کی طرف جہاں اتر پچھم میں کچھ پھوئیں پھوئیں سے بادل جمع تھے۔ پھر سلامتی کی طرف دیکھتے ہوئے، بولا "ہاں ٹھیک ہے .... کل ہزاری نے وہاں سے شراب کا مٹکا نکالا تھا" اور اس نے اکھ کی طرف اشارہ کیا "بس مٹکے دو مٹکے جتنی ہی جگہ ہے" اور پھر اس نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا مگر اس کے پھڑکتے ہوئے ہاتھوں کو یقین نہ آ رہا تھا، ان کے قابو میں کیا چیز آئی اور کیا نکل گئی۔ اس نے

۱۔ جہاں تیرے ہل چلتے ہیں وہاں میرا بھی چرخا لے چل

اپنے آپ میں ہمت کی بھی کمی پائی اور سوچا.............. آج دو گھونٹ شراب تیزاب کے اندر ہوتے تو مزہ آجاتا اور پھر دن بھر لڑکے اور ڈھول کے بعد اسے اپنا آپ کچھ گندہ بھی لگ رہا تھا۔ منہ سے ماں بہن کی گالیوں کی بو آرہی تھی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ بولا

"اچھا سلامتیے، بھولنا نہیں..........."

"میں نہیں، تو ہی بھول جائے گا۔" سلامتی منگل کی نگاہوں کا شک دور کرتے ہوئے بولی۔

"نہیں" منگل نے کہا۔

..........اور آدھے چاند کی رات میں منگل سلامتی کی نظروں کو دلتا ہوا چلا گیا۔ بدن میں ایکا ایکی ایک تناؤ سا پیدا ہو جانے کی وجہ سے اس کی چال ہی بدل گئی۔ ریڑھ کی ہڈی میں کوئی سانپ لہراتا بند ہو گیا تھا اور پیچھے سے دیکھنے پہ وہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے انسان نہیں، کوئی لٹھ جا رہا ہے۔

سلامتی وہیں کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی۔ اسے بھی بھادوں کے جھونکے لگے تھے اور اس کا بدن ہوا میں پڑے سلگتے ہوئے کوئلے کی طرح کبھی بھڑک اٹھتا اور کبھی بجھ جاتا۔ یوں معلوم ہونے لگا تھا جیسے آدھی رات کے وقت جب منگل آئے گا تو سلامتی شور مچانے، اسے پکڑوانے، پٹوا دینے کے منصوبے کو عمل میں نہیں لائے گی.......... گھر کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے اس نے اپنا تہ بند کسا کہ سامنے سے عنایتی، سلامتے کی بڑی بہن آگئی۔

"تو کہاں سے.......... آپاں؟" سلامتی بولی۔

"شرماں دائی کے ہاں سے.......... جوشاندہ لے کر آئی ہوں۔"

"جوشاندہ؟".......... وہ کس لیے؟"

"مرنے کے لیے۔" عنایتی نے بیزاری سے کہا۔

سلامتی کچھ نہ سمجھی۔ عنایتی نے کچھ شرماتے، کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔ "عورت ہونا بھی ایک ہی لعنت ہے" ....

"ہوہائے!" سلامتی نے کچھ پتاپاتے ہوئے کہا "روڈا پٹکی پٹاتو ابھی سال بھر کا بھی نہیں ہوا..............؟"

"اسی لیے تو........... یہ مر رہی ہوں" عنایتی نے کاڑھے کی بڑی سی پُڑیا کو ماتھے کے ساتھ مارتے ہوئے کہا۔ پھر دونوں مل کر گھر کی طرف چل دیں۔ سلامتی بولی "یہ سب کرنے سے پہلے تم نے مراد سے پوچھ لیا"؟

..............مراد عنایتی کے میاں کا نام تھا۔

"آنہہ!" عنایتی نے اپنی بانہہ جھٹکتے ہوئے کہا "اس نامراد سے پوچھنے بیٹھتی تو ابھی تک گیارہ ہوتے.......... میرا پیٹ ہے کہ ملوک سنگھ کا آنواں...........؟"

سلامتی کو جھرجھری سی آئی وہ الھڑ بہت کچھ نہ جانتی تھی لیکن کائنات میں مادّہ تھی جس کے رحم ہوتا ہے.......... وضع حمل اور تولید کے نام ہی سے جس کے اندر ایک نامحسوس سی کسمساہٹ دوڑ جاتی ہے۔ سلامتی نے کہیں دور کی بات سوچی۔ آخر یہ ہوتا ہے؟...... یہی ہوتا ہے تو پھر؟........... جب تک عنایتی دروازے کے اندر پیر رکھنے جارہی تھی۔ سامنے اس نے مراد، اپنے میاں کو اپنی سالی عائشہ سے چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھا اور الٹے پانو باہر آکر سلامتی سے بولی۔ "ایے! پھر ملا تجھے وہ بھاتیہ لڑکا؟"

"کون؟" سلامتی نے کہا.......... حالانکہ جانتی تھی عنایتی کہاں مار کر رہی ہے۔

"ارے وہی، اکے والا .... منگلو؟"

سلامتی نے جب تک سوچ لیا.......... "نہیں" وہ بولی ....

اس کے بعد اندر جاکر عنایتی عائشہ، روڈے، مراد وغیرہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جہلم پھر ترکاری کے بدلے، صبح گوشت میں ڈالنے کے لیے چنے کی دال لینے گئی تھی۔......

اسے کا ہمیشہ کی طرح کچھ پتا نہ تھا............ سلامتی ایک کھاٹ پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ اس دن کا دہاڑنے والا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور وہ شرم اور خجالت سے لال ہو اٹھی نہ جانے کیا ہو گیا مجھے! ایسے بھی کوئی مانتا چلا جاتا ہے کسی کی بات؟ وہ کہتا............ اتار دے اور بھی کچھ تو میں وہ بھی اتار دیتی............ پاگل! کیسے پھر گلی میں آ کر کرتا پہنا اور اپنے یہ دوزخی چھپائے............ اللہ! کوئی دیکھ لیتا تو............؟

کچھ ہی دیر میں سلامتی، اپلنے کھولنے لگی............ بولا............ ہو گئی سیر، چلی جا اب............ اور مجھے جانا پڑا۔ اتنی بے عزتی نہ ہوئی ہو گی کسی ماں کی، بیٹی کی۔ پر جس چیز کو آپاں بے عزتی کہتی ہے، میں اسے بے عزتی نہیں کہتی............ پھر وہ اٹھی اور ہانڈی لے کر سب کو کھلانے پلانے کے بہانے عنایتی کے پاس چلی گئی اور جب سب جنے تھوڑے ادھر اُدھر ہوئے تو اس نے عنایتی کو منگل سے اپنی ملاقات کا واقعہ بتا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ وہ ملنے آئے گا مدرسے کے باہر اکیلے میں............

تھوڑی ہی دیر بعد مراد، گانو کے دو چار بد معاشوں کو لے آیا۔ اپنی غریبی، اپنے افلاس کے باوجود وہ یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ ایک کافر کسی مسلمان لڑکی کی عزت پہ ہاتھ ڈالے............ سب نے مل کر جلدی جلدی لاٹھیاں، چھریا اور گنڈاسے جمع کر لیے............ اور پھر بیٹھ کر، برسوں پہلے کے جاترن اور تلوکے کے قتل کی باتیں کرنے لگے......

(۸)

منگل نہادھو چکا تھا اور اب اپنی داڑھی کو کچی گھانی کا تیل لگا رہا تھا۔ صبح جب خیرے نے پڑے میں سرسوں ڈالی تو پہلی چند بوندیں بوتل میں منگل نے لے لی تھیں ....
نصیبوں والے اڈے سے لوٹ کر، سلامتی سے ملنے کے بعد منگل چھوں سے کھیلا بھی، بڑی کی چوٹی بھی کھینچی اور ماں جنداں سے بڑی کے لیے "بابو" دیکھنے کی باتیں بھی کیں ....
اور پورا گھر چہک اٹھا..........

'آج رانو اسے اچھی لگ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی شادی کو دو چار سال ہی ہوئے ہیں اور وہ بچے اس کی بڑی سوت کے ہیں۔ یا وہ بڑا بھائی ہے اور چھوٹے بھائی کے قتل ہو جانے پر، اس نے اس کی بیوی پہ چادر ڈال لی ہے .... نہیں نہیں، یہ نہیں ہوتا۔ چادر چھوٹا بھائی ہی ڈالتا ہے۔ بڑے بھائی کے لیے چھوٹے کی بیوی، بہو بیٹی کی طرح ہوتی ہے۔

چونکہ منگل خود، معمول کے خلاف، آج شام کو نہادھو کر صاف ستھرا ہوا تھا اس لیے رانو اسے غلط سمجھ گئی تھی...... وہ سمجھی یہ سب میرے لیے ہے، آج کا دن میرا تھا، رات بھی میری ہے.......... رانو کو دیکھ کر منگل سمجھا یہ اس کی آنکھوں کا قصور ہے لیکن نہیں ...... آج رانو اپنی ہی آنکھوں، اپنے ہی دل، اپنے ہی گالوں .... ہونٹوں، کولھوں، رانوں کا قصور تھی۔ آج صبح جب وہ "نہا کر جوہڑ میں سے نکلی تو سُلفے کی لاٹ معلوم ہو رہی تھی۔" پھر اس نے گھر پہنچ کر دن میں کئی بار ابٹنا مل کر جلد کو اتنی نرم اور چکنی بنا لیا تھا کہ

اس پر سے نگاہیں اور جذبے پھسل پھسل جاتے تھے اور پھر وہیں پڑے مچل مچل جاتے اور اس وقت تک الگ نہ ہوتے جب تک کوئی ان کا ہاتھ پکڑ کر نہ اٹھائے.......... پھر اس نے بندی لگا رکھی تھی۔ کوئی غور سے دیکھتا تو پتا چلتا آج ہو صرف بندی نہ تھی وہ صبح کا سورج تھی جو گہرا سرخ ہوتا ہے اور تیز تیز اپنے محور کے گرد گھومتا جاتا ہے پھر ایکا ایکی جیسے کرنوں کے انبار میں ہاتھ ڈال کر کسی نے چھپلا دیا.......... اخروٹ کی چھال کا رنگ ہونٹوں پر چلا آیا اور اب تک کے سوکھے ہوئے چھوہاروں کی بجائے وہ رس بھریوں کے ڈھیر معلوم ہونے لگے...... منگل نے ایک بار پھر ذرا غور سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"تو آج باجار گئی تھی؟"

رانو نے ایک اچٹتی ہوئی نظر منگل پہ ڈالی اور پھر اسے اپنی طرف یوں دیکھتے پا کر نگاہیں چرالیں اور دلھنوں کی سی دھیمی آواز میں بولی "ہاں" اور پھر کام کاج کے بہانے، اپنا آپ ادھر ادھر چھپانے، وقت بتانے لگی۔

رانو کیا چھپا رہی تھی؟ یہ بات نہیں کہ وہ سگھڑ سیانیوں کی طرح اپنا سارا کچھ ایک ہی دم نہ دے دینا چاہتی تھی بلکہ کوئی بات تھی جو اپٹنے، بندی، اخروٹ کی چھال اور رس بھریوں سے اوپر ہوتی ہے جس کا تعلق عورت کی شکل و صورت سے نہیں ہوتا، نہ اس کی نسائیت اور اس کی انتہا سے.......... جسے وہ دھیرے دھیرے سامنے لاتی ہے اور جب لاتی ہے تب پتا چلتا ہے.......... یہ بات تھی! جیسے اشٹم کا چاند اپنا آدھا چھپائے رہتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ، روز بروز، ایک ایک پردے.......... دوپٹے چولی، انگیا، سب کو الگ ڈالتا جاتا ہے اور آخر ایک دن، ایک رات پورنیا کے روپ میں آ کر کیسی بے خودی و مجبوری، کیسی ناداری اور لاچاری کے ساتھ اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے.......... کیا علم النساء، علم النجوم سے دور کی بات ہے؟ کوئی بھی علم دوسرے علم سے فاصلہ رکھتا ہے؟.......... جن لوگوں نے برسوں اور عادتاً آسمانوں پہ جھانکا، ستاروں کو دیکھا ہو، ان کی جھل مل کے ساتھ

مرے بل بل کے ساتھ جیے ہوں اماوس کے ساتھ مر جھائے، پونم کے ساتھ کھلے ہو۔ وہی رجنی کی آنکھوں میں پلکوں کے نیچے، زمینوں سے بڑی آسمانوں سے بڑی، برق و مقناطیس کی وسعتوں میں جو راس رچائی جاتی ہے، جو بھنگڑے اور جھمر اور لڈی ناچے جاتے ہیں، ان کے راز سمجھتے ہیں.......... وہی اشٹم کے چاند کا بھید بھی جانتے ہیں......

منگل اِکے والا، پھر سلامت میں بے سلامت ہو کر اس گھر کی اشٹم کا بھید کیسے سمجھتا؟ اس نے کبھی آسمانوں پہ جھانکا ہی نہ تھا۔ وہ تو یہ بھی نہ جانتا تھا وہ خود ایک ستارہ ہے ....سورج جو کبھی کسی کو اپنی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا جو دیکھتا ہے اندھا ہو جاتا ہے اس کے طلوع و غروب، اس کے توازن و اعتدال، شب و روز آپس میں سر ٹکراتے، مر جاتے، سلف کا حصہ ہو جاتے ہیں......... بنات النعش اس کی طرف دیکھتی ہوئی معدوم چاند.........بے نور، کاغذی ہو کر گھٹتا گھٹتا گھٹ جاتا ہے اور آخر عدم کی پنہائیوں میں گم ہو جاتا ہے اور وہ...........سورج...........بے خبر......

لیکن آج.........اس بے خبر سے منگل کو رانو کچھ خبریں دینا چاہتی تھی۔ وہ اس گھونگھٹ کو اٹھا دینا چاہتی تھی جو منگل اور اس کے بیچ حائل ہو رہا تھا۔

گھنڈ انھیاں کرے سو جاکھیاں نوں گھنڈ لاہ منہ اتوں لاڑیے نی
وارث شاہ نہ دیتیے مرتیاں نوں پُھل اگ دے وچ نہ ساڑیے نی

گھونگھٹ دیکھنے والوں کو اندھا کر دیتا ہے۔ اے دلھن تو اسے مکھڑے پر سے ہٹا دے وارث شاہ! موتیوں کو دفنا کر نہیں دیکھتے۔ نہ پھولوں کو آگ میں جلاتے ہیں ....اور آج رانو نے اس پردے اور حجاب کو دور کر دینے کی ٹھان رکھی تھی جسے بیچ سے ہٹائے بغیر خدا بھی نہیں ملتا۔

اُدھر منگل آج جیسے کوئی رشوت دینا چاہتا تھا۔ اس نے کرتے کی جیب سے رانو کے لیے بالوں کی کچھ سوئیاں نکالیں۔ لوٹتے ہوئے جنھیں وہ قصبے سے لے آیا تھا۔ انھیں ہاتھ

میں لیتے ہی رانی چونک اٹھی۔ اس کے منہ سے ایک بے خودی کے عالم میں ہانکلی.......... عورت میں لذت کی انتہا، لیکن منگل کہیں دور دیکھ رہا تھا.......... پھر لوٹ کر اس نے پیسے نکالے اور رانو کے ہاتھ میں تھما دیئے.......... رانو کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے لیکن اس نے حیران ہو کر پوچھ ہی لیا۔

"یہ آٹھ روپے.......... کہاں سے آ گئے؟"

"آج پسر ور کی سورای لگی تھی۔"

"تو..........؟"

تو کیا؟.......... کھاؤ، خرچو۔" اور پھر پہلی بار، اپنی بیاہتا زندگی میں پہلی بار اس نے معنی خیز نگاہوں سے رانو کے سنگھار کی طرف دیکھا اور بولا۔ "خرچ بھی تو بڑھ گیا ہے۔"

اور رانو پہلی بار، اپنی نئی بیاہتا زندگی میں پہلی بار ایک بیوی کی طرح شرمائی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ابٹنا، اس کی منہدی، اخروٹ کی چھال اور رس بھریاں سی ہو گئیں۔ اس نے ٹمنے کے پردے سے اپنا سب کچھ ایک بار ڈھک لیا وہ منگل کے قریب ہونے میں کتنی دور اور دور ہونے میں کتنی قریب ہو جاتی تھی۔ پھر اس نے بھی سوچا .... ابھی نہیں۔ ابھی تو مندر میں گھنٹیاں بھی نہیں بجیں۔ مسجد میں ملا نے اذان نہیں دی..........

منگل نے کہا.......... "کھانا نکال دے جھٹ سے۔"

"ابھی نہیں۔"

"کیوں؟.......... ابھی کیا ہے؟"

رانو کچھ گھبرا سی گئی۔ وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکی لیکن منگل نے خود ہی ایک انجانے پن میں اسے اس دبدا سے نکال لیا.......... "کیا کوئی بہت چھی تیز پکی ہے؟"

"ہاں" رانو نے کہا۔ اور پھر کھٹے سے اس کے دوپٹے میں کوئی توتا بولنے لگا۔ "چنے

کی دال پکائی ہے۔ ساتھ پودینے کی چٹنی۔ کراری مسالوں والی۔"

کتنی بھول ہوئی! منگل کو سب یاد آگیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے نتھنے پھولنے لگے اور بال جیسے اپنے آپ پگڑی سے باہر آگئے۔ اگر بالوں میں نہیں تو خیالوں میں ضرور اس دن والی من چھیاں، آک کی بڈھی مائیاں اڑی ہوئی تھیں وہ ایک دم خفا ہو کر بولا۔ "دو جو بھی پکا ہے نہیں میں جاتا ہوں، ضروری کام ہے۔"

رانو سنبھلتے سنبھلتے پھر گر سی گئی۔ اس نے کچھ اور ہی سوچا تھا اور ہی پکایا تھا...... شاید کوئی ایسی ویسی بات نہ بھی ہو........ اچھا ہی ہے، جب لوٹے گا بچے سو چکے ہوں گے۔ سسر کی کھوں کھوں، کھانپہ کھانپہ ساس کے شروع رات کے خراٹے بند ہو چکے ہوں گے۔ ایسی خاموشی ہو گی کہ سانس بھی روکنے پڑیں گے۔ ایکا ایکی منگل نے کہا۔

"میری وہ کرتی کہاں ہے؟"

"رانو سمجھ گئی......... سنسنا گئی۔

"کہاں جارہا ہے؟" اس کے منہ سے بے اختیار نکل آیا" دیکھتے نہیں بادل گھرے ہیں......؟"

"ہوں گے" منگل نے کہا۔ "تو کون ہے روکنے والی؟"

رانو بے بضاعت سی ہو کر رہ گئی۔ بولی "نہیں، میں تو کوئی نہیں......... ایسے ہی پوچھا تھا.........."

اگر رانی اڑ جاتی......... جیسے تلو کے کے ساتھ اڑ جاتی تھی اور کہتی "میں نہ روکوں گی تو اور کون روکے گا؟" تو منگل الف ہو جاتا لیکن وہ اپنی پھٹی ہوئی میلی بوسیدہ سی چادر کے رشتے کو سمجھتی تھی۔ منگل رانی کے اس مریل سے جواب سے کچھ ڈھیلا ہو گیا اور بات کو ختم کرنے کے اندر بولا "جارہا ہوں رنڈی کے ہاں........."

یہ فقرہ شوہر عموماً اس وقت کہتے ہیں جب وہ واقعی رنڈی کے ہاں جارہے ہوں اور

بیویاں سمجھتی ہیں ان کا میاں کسی غلط جگہ نہیں جارہا۔ ورنہ وہ ایسے کہتا؟ لیکن رانو کو حالات میں ہر لحظہ پیلا ہو جانے والے خطرے نے ایک ایسی سمجھ دے دی تھی جو اس کی دوسری بہنوں کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ ایکا ایکی وہ دیوی سے ایک عام گوشت پوست کی عورت بن گئی۔ ایک دم چالاک اور عیار.......... حرافہ! کیا کرتی؟ وہ مجبور تھی اور بے بس۔ آدمی پل پل حالات اور واقعات سے اثر پذیر ہوتا ہے، ان کے ساتھ بدلتا ہے، ورنہ پرماتما نے اسے اتنا بڑا انسوں کا جال نہ دیا ہوتا۔

کرتی کے مطالبے نے رانو کے شک کو یقین میں بدل دیا۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بھی نتھنے پھولنے لگے جو منگل کو رانی کے دوپٹے میں دکھائی نہ دیے۔ ایک بیوی کے مقابلے کے لیے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے، ایک بیسوا کی سطح پر اتر آئی تھی۔ اپنی نگاہوں کے افق پہ اسے سلامتی کا بدن لہراتا ہوا نظر آیا۔ جس کے بدن کے کسے کسائے اور متناسب اعضا میں متقابل کے لیے قدرتی جگہیں بنی تھیں۔ جس کے جسم کی تازگی اور شادابی کو ابٹنے اور بندی اور اخروٹ کی چھال کی ضرورت نہ تھی.......... جو سب چیزیں منگل سے استھول، پتھر آدمی کے لیے بے کار تھیں جو خود چٹان تھا، چٹانوں سے بھڑنا چاہتا تھا، خود لوہا تھا، لوہے سے ٹکرانا چاہتا تھا.......... اور رانو جانتی تھی اور اس کے لیے تیار تھی .... اس نے ایک اڑی نظر سے ٹرنک کی طرف اشارہ کیا اور بولی..........

"وہاں پڑی ہے تیری کرتی۔"

جب ہی باہر سے وڈیا کی آواز آئی.......... "رانو"

رانو ایک دم باہر لپکی اور اس سے پہلے کہ وڈیا کچھ کہتی.......... رانو نے اسے باہر دھکیلتے ہوئے کہا.......... "چلی جا.......... وڈو.......... اس وقت چلی جا"

وڈیا نے بے کاری ضد کرتے ہوئے کہا.......... "کیوں نی ؟"

رانو ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی "پرماتما کے لیے...... بڑے بڑوتوں کے لیے......"

اور ودیا حیرانی سے پیچھے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔

رانو اندر آئی تو منگل ٹرنک کھول چکا تھا۔ اس نے کچھ کپڑے ادھر اُدھر بکھیر رکھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں مٹھے مالٹے کی بوتل تھی اور آنکھوں میں چمک۔

"یہ کہاں سے آئی؟" اس نے رانو سے پوچھا۔

"یہ کیا؟"

یہ.......... "منگل نے بوتل کو ہوا میں اٹھاتے ہوئے کہا "مٹھے مالٹے کی بوتل!"

رانو نے کچھ لرزتے، کچھ باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے کیا معلوم؟" اور اسے بہت کچھ اپنا چھپانے کی ضرورت بھی نہ پڑی۔ ڈبو رونے لگا تھا...... رانو نے آدھی اندر آدھی باہر جا کر بانہہ الارنی شروع کر دی تھی.......... "ہات، ہات موئے!.......... یہاں دھرا کیا ہے، تیرے رونے کو.......... ؟ رو ان کے ہاں جا کر، جن کے ہاں ترکاری ملتی ہے، گوس ملتا ہے.........." اور پھر مڑ کر بولی "تیرا بھائی پیا کرتا تھا نا.........."

"ہاں مگر" منگل نے حیرانی سے کہا "اتنے برسوں سے..........؟"

"پڑی رہی ہوگی.......... میں نے تو جب سے اس ٹرنک کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

منگل بوتل گھما گھما کر دیکھ رہا تھا جیسے یقین نہ آ رہا ہو.......... بالکل وہی شراب تیز اب جس کی اس شام اسے طلب تھی جس سے اس نے چاہا تھا کہ اس کی ہمت بڑھے چیتے کی سی لپک آ جائے، دس گھوڑوں کی سی طاقت.......... اسے بھی اپنے ذہنی افق پر ایک تر و تازہ، تندرست و توانا لڑکی دکھائی دی، اس نے تھوڑا اندر باہر ہو کر اوپر، آسمان کی طرف دیکھا اب بادل گھر آئے تھے اور چاند کو اپنے لحاف و توشک میں چھپا لیا تھا۔

ضرور کہیں گرمی پڑی ہوگی، بخارات اٹھے ہوں گے جو اس مہینے بھادوں کے آخر میں کوٹلے کے اوپر چھا گئے.......... شاید کہیں رات اور دن برابر ہونے والے تھے.......... بادلوں کے بیچ میں سے اپنا گریبان پھاڑ کر دیکھتے ہوئے ستاروں سے اس بات کی

تسلی کر کے کہ ابھی پہلا ہی پہر شروع ہے، منگل لوٹ آیا لیکن لوٹنے کے بعد وہ پہلا سا منگل نہ رہا تھا۔ ایک عجیب قسم کی کرختگی اس کی نگاہوں میں چلی آئی تھی۔"

میں کبھی کبھی .... وہاں نصیبوں والے اڈے پر لگا لیتا ہوں۔" وہ انگوٹھا اور مٹھی منہ کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

"میں جانتی ہوں۔" رانو نے کہا۔

منگل نے پروانہ کی، نہ کسی استعجاب کا مظاہرہ .... پھر اس نے بوتل کی طرف دیکھا۔ حرص و آز نے بہت کچھ اسے دیکھنے نہ دیا۔ مثلاً رانو کی آنکھوں میں امڈ آنے والا سیل ساتھ ہی اس کا تیز ہوتا ہوا تنفس۔

"تیرے سامنے تو نہ پیوں گا" وہ اپنی ہی رٹ لگاتے ہوئے بولا۔

رانو چونکی ہو گی .... "کیوں؟"

تو برا مانتی ہے نا؟"

رانو کہے جا رہی تھی .... نہیں، میں کیوں برا مانوں گی؟ میرا حق ہی کیا ہے؟"

[illegible] سے کسی [illegible] نے اسے روک دیا۔ اس کی نگاہیں پھر ایک حرافہ کی نگاہیں ہو گئیں اور وہ بولی "ہاں، تو جانتا ہی ہے، مجھے زہر لگتی ہے۔"

پھر جیسا کہ رانو کا اندازہ تھا۔ جیسا کہ وہ منگل کو جانتی تھی۔ جیسا کہ وہ چاہتی تھی .... منگل ایک دم بھنا اٹھا۔ ایک دم بوتل کے گلے میں مٹھی گھماتے ہوئے اس نے کاگ کو ڈھیلا کر دیا پہلے چوروں اور پھر ڈاکوؤں کے انداز میں بولا "یہی ہے نا تم عورتوں کی بات...... کھانے پینے سے بھی روکتی ہو اپنے مردوں کو۔" اور وہ جھینپ گیا۔

رانو خوش ہوئی۔ زبانی ہی سہی مگر۔ عورت" اور "مرد" کا رشتہ تو قائم ہوا۔ اوپر سے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولی "خبردار، میں نہ پینے دوں گی۔"

بالکل جیسا کہ رانو نے سوچا تھا۔ منگل نے کاگ نکال کر باہر پھینک دیا۔ بو سی نکلی

اور سارے کمرے میں پھیل گئی۔ رانو نے ایک ہاتھ سے دوپٹہ ناک کے سامنے کر لیا اور دوسرا ہاتھ منگل کے ہاتھ اور بوتل کے منہ پر رکھ دیا۔ منگل نے رانو کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا ...."میں پیوں گا.........ضرور پیوں گا۔"

'تو نے اپنے بھائی کو ہٹکایا تھا.........بوتل توڑی تھی، مجھے چھڑایا تھا۔

"وہ...........وہ تو مجھ پر ترس کھایا تھا۔"

پھر...... جیسا کہ رانو نے سوچا تھا۔ منگل نے اس کے ہاتھ جھٹکنے شروع کر دیے بیچ میں بڑی آگئی۔ اور دونوں کو ایک دوسرے کے اتنا قریب پا کر ٹھٹک گئی......... جب ہی باہر سے بادل کی گرج سنائی دی "جا تو" رانو اسے دیکھ کر بولی "کھانا کھلا دے، سلا دے سب کو اندر، پانی پڑنے والا ہے۔" بڑی نے باہر جاتے ہی اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ آج وہ صبح ہی سے ماں کے تیور دیکھ رہی تھی اور کچھ کچھ سمجھ بھی رہی تھی۔

رانو پھر بوتل پر جھپٹنے لگی اور منگل اسے دھکیلنے لگا۔ اس کے سخت اور کھردرے ہاتھ، رانو کے بدن کے ہر حصے کو لگ رہے تھے۔ بیچ میں اس نے کچھ رکھ رکھاؤ کیا بھی لیکن چادر کا بیع نامہ تھا جو راون کا بدن توڑ رہا تھا۔ وہ بار بار ایک دم بوتل سے منہ لگا کر پیتے ہوئے، ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا "میں اپنے بھائی کی طرح نامرد نہیں جو ایک عورت کے سامنے ہتھیار ڈال دے گا۔"

منگل نے اس چھینا جھپٹی میں ایک تہائی بوتل خالی کر دی۔ رانو کچھ اور لپکی۔ منگل نے اب اسے نیچے فرش پر گرا دیا اور پھر جوش کے عالم میں اسے زدو کوب کرنے لگا...... بالکل ایسے ہی جیسے رانو نے سوچا تھا.......... وہ اوپر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی اور منگل اسے نیچے دبانے کی۔ بیچ میں ایک ہاتھ سے بوتل اٹھا کر وہ پھر پی گیا.......... ہولے ہولے اس کا چہرہ لال ہونے لگا۔ خون کانوں اور سر کی طرف آنے لگا۔ رانو کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ اس کے اعضا میں ایک ایسی تڑپ پیدا ہو گئی جسے زیر کرنا مشکل

ہو گیا.......... ناممکن.......... اب کے جو رانی اٹھی تو منگل نے اسے دیوار کے ساتھ دے مارا..........

خون کا ایک فوارہ رانو کے سر سے چھوٹا اور اس کی ٹانگیں اسے سنبھالنے کے قابل نہ رہیں۔ وہ زمین پر پڑی تھی.......... آنکھیں بند اور منہ کھلا ہوا.......... رانو کی خاموش بغاوت کے باوجود آواز جنداں تک پہنچ گئی اور وہ بولی۔

"کیا ہے بہو؟"

ایک عجیب قسم کی لذت سے بے ہوش ہوتے ہوئے رانو نے جواب دیا "کچھ نہیں تائی، بلّی ہے!".......... اور پھر اس پر ایک غنودگی سی چھانے لگی۔ بدن کے اعضاء ڈھیلے پڑ گئے جہاں ہاتھ پڑا تھا، ٹانگ پڑی تھی اور جہاں کپڑا پڑا تھا، کپڑا.......... نیچے شراب گری تھی یا پانی.......... رانو کی سلوار تربتر ہو رہی تھی۔ اب تک جو کچھ ہوا اس سے یہ نہ معلوم ہوتا تھا دونوں میں سے کس نے پی ہے؟ نشہ کسے آیا ہے؟.......... کس کا اترا ہے؟..........

منگل رانو کے پاس حیران کھڑا تھا۔ عجیب عورت ہے! اتنی مار پڑی اس پر بھی کہہ دیا .... بلّی ہے!.......... وہ شرمسار تھا اور شکر گزار بھی۔

پگڑی پھاڑ کر اس نے رانو کے زخم پونچھنے شروع کر دیے اور پھر کپڑے کو مٹھی میں رکھ کر اس پر سانس کی دھونکنی چلانے لگا۔ رانو کے بدن پہ جہاں جہاں سوجن تھی۔ لگانے لگا۔ ویسے ہی جیسے اس رات رانی نے کیا تھا.......... رانی کو آرام آ رہا تھا۔ حظ آ رہا تھا اور منگل کو رونا، اور اس رونے میں کفارے کی تسکین روتے روتے اس نے رانی کے پاتو پکڑ لیے۔ اب وہ اسے اوپر کھینچ رہی تھی، اس کا بدن سہلا رہی تھی.......... جیسے مار اسے نہیں منگل کو پڑی ہے۔

"معاف کر دے، مجھے معاف کر دے۔" منگل رٹ لگائے جا رہا تھا۔ "

وعدہ کر، پھر نہ پیے گا" رانو نے اس کے ساتھ لگتے ہوئے کہا اور پھر ایک دم کسی

خطرے سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے پیش قدمی کرتے ہوئے بولی "وعدہ کرے گا تو میں آج تجھے اپنے ہاتھ سے پلاؤں گی۔ "..........

"میں وعدہ کرتا ہوں" منگل نے کہا اور پھر سوچنے لگا، اس نے کس بات کا وعدہ کیا ہے؟.......... رانو آہستہ سے اٹھی اور باہر چلی گئی۔ منگل بیٹھا برتنوں پر بارش کی جلترنگ سن رہا تھا۔ بڑی نے سب کو کھلا پلا دیا تھا اور کہیں دور، اندر سلا دیا تھا جیسے، ہمیشہ کے لیے.......... جیسے انسان اور قدرت کے درمیان اس عظیم سازش میں وہ بھی شریک ہو گئی تھی.......... رانو نے تنور کو برسات سے بچانے کے لیے اس پر ایک بڑا سا دابڑ رکھ دیا اور پھر کھانا لے کر اندر چل دی۔

رانو لوٹی۔ تھالی میں ایک طرف روٹی پڑی تھی اور دوسری طرف کچھ پیاز اور...... چانپیں! منگل نے حیران ہو کر چانپوں کی طرف دیکھا اور پھر رانی کی طرف اور اس کے منہ میں پانی آنے لگا۔ رانو نے گلاس میں ایک دم بہت سی شراب انڈیل دی اور منگل کے ہاتھوں میں تھما دی۔ منگل کو جیسے یقین نہ آ رہا تھا۔ کھانے سے نظریں ہٹا کر اس نے رانی کی طرف دیکھا جس کی نگاہیں پیالے بنی ہوئی تھیں۔ پھر وہ انکار نہ کر سکا۔ گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔

"آج کے بعد پیوں تو سمجھو.......... گائے کھاؤں؟"

اس نے گلاس منہ کی طرف اٹھایا تو رانو نے روک دیا" ٹھہرو".......... جیسے اسے کوئی بات یاد آ گئی۔ وہ باہر گئی اور تھوڑی دیر کے بعد لوٹی تو ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی چینی کی رکابی تھی اور اس میں دل کی شکل کا ایک ٹماٹر.......... جو آٹھ حصوں میں کٹا پڑا تھا۔

منگل پینے اور کھانے لگا۔ رانو رو رہی تھی.......... ایسا مزہ منگل کو نصیبوں والے اڈے پہ کہاں آیا تھا؟ روتے کانپتے ہوئے رانو نے اور انڈیلی.......... اور.......... اور...... اور شراب رانی کو چڑھ گئی...... رانی کو! چھینپنے کے بجائے وہ کھلنے لگی۔ پہلے جالی کا دوپٹہ جیسے

اتفاق سے گر گیا۔ پھر کرتے کے تکمے کھل گئے جب ہی مندر کے گھنٹے سنائی دیے، پھر مسجد سے اذان۔

"ہات!" منگل نے گھنٹے اور اذان سنتے ہوئے کہا............

"ہات کیا؟" رانو پوچھنے لگی۔

"یہ" منگل نے اپنا غیر یقینی ہاتھ جہلم اراعین کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا "یہ ملا اور پنڈت۔"

اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی، دروازے تک گیا بھی لیکن باہر گھپ اندھیرا دیکھ کر، لڑکھڑاتا ہوا اپنی جگہ پہ آرہا۔ پھر ایکا ایکی اپنی آنکھوں پر پورا زور ڈالتے ہوئے وہ سامنے دیکھنے لگا .... رانی کھڑی تھی۔ پونم کا چاند!............ جو بے صبر ہو کر آدھے سے پورا ہو گیا تھا اور بادلوں کے لحاف و توشک کو چیرتے، پھاڑتے ہوئے، نیچے مزین پر اتر آیا تھا۔

منگل اٹھ کھڑا ہوا اور سانس روک کر دیکھنے لگا۔ بہ مشکل تمام بولا۔ "تم............ تم نے کپڑے کیوں پہنے ہیں؟"

رانو نے اپنا پھٹا پرانا جالی کا دوپٹہ اٹھایا اور اسے اپنے اور منگل کے بیچ تانتے ہوئے بولی "لو اتار دیے" اور دوپٹے کو دواٹھے ہوئے ہاتھوں میں تھامے، رانو پہلو کی طرف مڑی .... عورت کا حسن ثلاثہ منگل کے سامنے تھا جس سے گیہوں کی روٹی کھانے والا کوئی بھی مرد انکار نہیں کر سکا............ اور بیچ میں لطیف سا پردہ............ پھر، اس حسن پر ایک انگڑائی، ٹوٹی............ سال کے، دن ہفتے، ہفتے کے سات دن، دن کے آٹھ پہروں، گھنٹوں اور پلوں میں ایک ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب چاند لپک کر سورج کو سر سے پانو تک گہنا دیتا ہے۔

منگل کے چہرے پر سرخیاں اور سیاہیاں دوڑ گئیں۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور جسم کے مشام اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر کہیں چل دیے............ کبھی بارش کے ڈر سے چھپتے، کبھی

اس کے لیے باہر آتے۔ ساون اور بھادوں میں تو بارش ہمیشہ ہوتی ہے جہاں تہاں بھی ہوتی ہے لیکن بڑوں کا کہنا ہے جب بھادوں اور سورج کے بیچ دن اور رات ملتے ہیں، برابر ہوتے ہیں تو دیوی کے کوٹھے پر ضرور چھینٹے پڑتے ہیں، بے شمار پڑتے ہیں.......... منگل نے ایک اندھے کی طرح لپک کر، اندازے ہی سے رانو کو کلاوے میں لے لیا۔ پھر ایک ہی لمحے میں وہ جسم کے تپتے ہوئے زعفران زاروں پہ تھے.......... اس سے پہلے کہ ان کے سانس تیز ہوتے ہوئے وہاں پہنچ جاتے جہاں سے وہ پھر لوٹ کر نہیں آتے، منگل رانو سے کہہ رہا تھا۔

"آج تم.......... کتنی کھوب شورت لگ رہی ہو.......... بھابی!"

(۹)

گھر کے دروازے میں کھڑی، آسمان سے مسلسل بارش پڑتے دیکھ کر سلامتی جھلا رہی تھی۔ اپنے تاکوں پہ ہلکے ہلکے تھپیڑے لگا رہی تھی۔ پھر وہی ہاتھ اس نے کولھوں سے نیچے تھپکنے شروع کر دیے اور سی سی کرنے لگی جیسے غلطی سے اس نے ایک ساتھ بہت سی مرچیں کھالی ہوں...... گھنٹے اور اذان کی آخری گونج اس کے کانوں سے معدوم ہو رہی تھی اور وہ ملاؤں اور پنڈتوں کو کوسنے دے رہی تھی۔ جنھوں نے انسانی جسم بنایا تو نہ تھا البتہ اس سے انکار، اسے گالی دینے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے............

رات کے دوسرے پہر کا آخر تھا اور بارش تھی کہ ہٹ ہٹ کے پڑ رہی تھی۔ مدرسے کے برآمدے میں، اکیلے کے برابر کھڑے مراد نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"بکواس ہے یار، یہ عورت بھی۔"

خلیفے نے اتفاق کیا اور اللہ داد اور حکومت نے بھی۔ اور پھر سب اپنے اپنے لٹھ اور ٹوکے اور چھویاں اور گنڈاسے لے کر، بارش میں بدن کی چربی تک بھیگتے ہوئے اپنے اپنے گھر کی طرف یہ کہتے ہوئے چل دیے "بچ گیا سکھڑا۔"

مراد کو نامراد لوٹتے دیکھ کر دور، اندر چارپائی پہ پڑی ہوئی سلامتی نے ہاتھ مار کر دیے کو بجھا دیا۔ پھر اپنے بدن پہ اس دن کی آخری انگڑائی توڑی اور بولی۔

"شکر ہے اللہ............"

(۱۰)

آج سورج نے چھدرے چھدرے بادلوں کے پیچھے اپنا منہ چھپا رکھا تھا۔ آج آسمان کے کوٹلے پر کوئی نادان اپنی محنت سے شرمسار، روتا کڑھتا ہوا اپنی پھٹی چادر اوڑھ کے سو گیا تھا۔

ہوائیں چلنے لگی تھیں جن کے دوش پہ لہراتے ہوئے کہیں لوب نار، کوک نار، اور پامیر اور سلیمان کی طرف سے چھوٹے چھوٹے سفید پرندے آنے شروع ہوئے۔ معلوم ہوتا تھا دور، ہزاروں فرسنگ دور، کہیں کھیلنے والے بچوں نے کاغذ کی کشتیاں، وقت کے دھارے پہ چھوڑ دی ہیں یا وشنو دیوی چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں وہ سب نذرانے لوٹا رہی ہے جو صدیوں میں جاتریوں نے ڈھولکیاں اور چھینے بجا بجا کر، امبا دیوی کی استتی گا گا کر اس کی خدمت میں پیش کیے تھے۔

شب و روز بے اعتدال ہو رہے تھے۔ راتیں دن پہ بھاری ہونے لگیں۔ شکست خوردہ سورج شب کے سامنے شرمایا اور بادل کے پردے سے منہ نکال کر اپنی زمین کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔ بس اس کے مسکرانے کی دیر تھی تیتر کے پروں پہ رنگ بکھر گیا۔ دراج و سار کی چال میں نئے انداز چلے آئے اور نیم کی نازک سی ڈالی پہ جھولتی، وزن درست کرتی ہوئی جھاپلی کے گلے میں سے ایک مترنم اور مطیب بے اختیاری پھوٹ نکلی.......... سورج نے نہ صرف جامن اور بکائن اور لنڈے پیپل کے پتوں سے صلح کی بلکہ ببول اور کنوار گندل کے بدن پہ اُگے ہوئے کانٹوں کو بھی اپنا کہا۔ اور زمین کے آنسو چوم

چوم لیے.........

کسانوں نے کہیں آنسوؤں کے بیچ، زمین کو زیر لب، دبی دبی ہنسی ہنستے دیکھ لیا اور وارفتہ ہو کر اپنے اپنے ہل نکال لیے اور اس مست الست کاشت کو خریف کا نام دیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے تک شہتوت کی کچی کنواری ڈالیاں توڑ لائے اور ان کی کمانیں بنا، ان پہ چلّے چڑھا، ادھر اُدھر بے ربط سے تیر پھینکنے لگے۔ مسجد میں ملاؤں نے اور مندر میں پنڈتوں نے تمناؤں کی شومیدھ کے گھوڑے چھوڑ دیے اور پوری کائنات ایک مسلسل، نہ ختم ہونے والی جندہ بازی میں لگ گئی.........

منگل نے اپنا ساز نکالا اور اس پر کلغی سجائی۔ رانی نے تنور پر سے دابڑہ اٹھایا اور اس کے کچھ گیلے ہونے کی وجہ سے اس میں ڈھیر سی چیلیاں اور من چھٹی ڈال دی۔ رات کی آمدنی سے ایک روپیا نکال کر بڑی کو دیا تاکہ جاٹوں کے ہاں جا کر خالص گھی تلوا کر لیتی آئے۔ مدرسے میں بڑے بچوں کے شش ماہی امتحان ہو رہے تھے اس لیے چھوٹے چموں جہلم ارا عین کے ہاں مولیاں اور آلو لینے کے لیے پہنچا تو سلامتی کے سر گرد جالی کا دوپٹہ باندھے بیٹھی تھی.........اور کنپٹیوں پہ آٹے کی چڑیاں لگائے.........

چموں کو مولیاں اور آلو خریدتے دیکھ کر سلامتی بول اٹھی.........کیا بات ہے چمیا؟".........آج تمھارے آلو اور مولی کی روٹیاں پک رہی ہیں؟"

"روٹیاں نہیں، پراٹھے۔" چموں نے اتراتے ہوئے کہا.........."ماں نے تنور تپایا ہے نا.........

"ہائے ہائے دے۔" جہلم کہنے لگی.........."تیری ماں نے تنور تپایا ہے۔"

"ہاں!" چموں نے زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا: "تمھیں پراٹھے لگوانے ہوں تو آجاؤ یا سلامتی کو بھیج دو۔"

پھر وہ سبزی لے کر چلا گیا اور پیچھے جہلم، عنایتی اور عائشہ ہنستی رہیں۔ سلامتی

طبیعت کے خراب ہونے کی وجہ سے جلی بھنی سنتی رہی۔

پکتے ہوئے پراٹھوں میں سے خوشبو اٹھ رہی تھی اور اندر بیٹھے ہوئے حضور سنگھ اور جنداں کو للچا رہی تھی۔ حضور سنگھ سے نہ رہا گیا۔.......... "ذرا نرم لگانا بیٹی" اس نے کہا "میرے دانت کام نہیں کرتے۔" اور جنداں بھی نہ رہ سکی۔ بولی "دیکھ تو.......... ہر وقت کھانے کی پڑی رہتی ہے.........."

رانو نے گھی میں بسے پراٹھے، نئے، صاف ستھرے جھاڑن میں باندھ کر منگل کی طرف بڑھا دیے۔ منگل نے مخموری نگاہوں کے ساتھ رانو کی طرف دیکھا اور پھر اس کے کیچڑ سے پٹے آنگن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"بہت صفائی کرنی پڑے گی؟......"

رانو نے دیکھتے ہوئے کہا.......... "ہاں!" اور پھر ایک عجوب سی نگاہ منگل پر ڈالتے ہوئے بولی.......... "ہم عورتیں اور بنی کس لیے ہیں؟"

منگل نصیبوں والے اڈے کے لیے نکلنے ہی والا تھا کہ رانو کو کوئی بات یاد آ گئی اور وہ فوراً بول اٹھی "ٹھہرو!"

منگل وہیں رک گیا۔ کچھ دیر میں رانی دوڑی ہوئی اس کے پاس آئی اور بولی "مجھے دو شلواروں کا کپڑا لا دو.......... تیوہار آ رہے ہیں.........."

منگل نے ابھی جواب بھی نہ دیا تھا کہ رانو اپنے بدن پہ، سامنے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کہنے لگی "سب کے پاس یہ ہے میرے پاس ہی نہیں۔" ...... اور پھر اوپر دیکھتے ہوئے وہ صرف مسکرائی نہیں کھل کھل کر کے ہنس اٹھی۔

منگل نے تھوڑا سا سر ہلاتے ہوئے کہا...... "اچھا دیکھو۔"

"دیکھو ویکھو کچھ نہیں۔" رانو نے بے جھجک کہہ دیا۔ میں کیا سب کے سامنے شلوار کے پھروں گی اور پھر بولی "میرا تو کچھ نہیں جاتا.........."

منگل نے ایک دم اپنا سر ہلایا جیسے اپنے حق کو کسی دوسرے سے خلط نہ کرنا چاہتا ہو
...... رانو وہ پھر کہنے لگی .... چنوں کو اس کے گھر والے نے صوف کا سوٹ سلوا دیا ہے
.... کیسا اچھا لگتا ہے اس کے گورے پنڈے پر کالا کالا، نرم نرم صوف۔

منگل سوچنے لگا۔

رانو نے اور آگے ہو کر منگل کے اُریب کرتے کا دامن تھام لیا اور بولی...... تم آج پھر پسرور نہیں تو گوجرانوالے نہیں سیالکوٹ سمڑیال کی سواریاں ڈھونڈ لینا بچے بھی قیصیں مانگتے ہیں............"

منگل جیسے ایک دم فرمائشوں کے شیریں و ترش انبار کے نیچے دب گیا۔ ساز میں سے کلغی نیچے گر گئی جسے اٹھاتے پھر سے نکالتے ہوئے اس نے رانی کی طرف دیکھا جو ابھی تک اس کا کرتا تھامے ہوئے تھی جیسے منگل اس کا چور تھا جیسے رانو کا کوئی قرض تھا جسے منگل کو چکانا تھا۔

"اچھا بابا اچھا" .... منگل نے اپنا کرتا چھڑا لیا اور چل دیا۔ رانی السائی سی کھڑی، چوکھٹ میں جڑی، ہمیشہ کی طرح اُسے جاتے دیکھتی رہی۔ اس کا مرد .... تخیل اور تعمیل کی ایک رات اور آدھے ہی دن نے جس کی عمر میں دنوں، مہینوں اور برسوں کا اضافہ کر دیا تھا! پھر رانی اسے کچھ دیکھ کر ایکا ایکی ٹھٹک گئی ....

تلوکا! .... نہیں منگل .... منگل .... لیکن، یہ وہ منگل تو نہ تھا جسے ایک دن رانو نے دیکھا تھا، جس دن چنوں نے اس پہ چادر ڈالنے کی بات کی تھی اور ایک البیلے پن میں وارث گاتے ہوئے جسے گلی کے نلکو نے لپک لیا تھا .... آج وہ چپ تھا اور اس کے چوڑے چکلے کاندھے محبت کے بوجھ سے دب گئے تھے جس کارن وہ آپ ہی اپنا بڑا بھائی معلوم ہونے لگا تھا ....

وہ جا رہا تھا اور گلی کے نلکو جیسے پرے ہو گئے تھے۔ گانو سے باہر کے کالے کوس ایک

دوسرے میں الجھ گئے تھے۔ الجھتے سلجھتے راستے کہیں بھی جاتے تھے لیکن ایک بات طے تھی کہ ان پہ اڑتی ہوئی دھول اور گرد کیچڑ اور غلاظت میں ہر منگل کا خون اور پسینہ رچا ہوا تھا۔ پھر راستوں کے اس گورکھ دھندے میں ایک راستہ ضرور ایسا تھا جو ہر جانور، ہر انسان کو سر شام "گھر" لے آتا تھا۔

اپنی نگاہوں کے دھندلکے میں منگل کے حل ہوتے ہی رانی اندر لوٹ گئی۔ آج اس کے پانو یقین سے زمین پہ پڑ رہے تھے۔ آج ہر چیز کتنی آسان، کتنی سبک ہو گئی تھی جس کے مقابلے پہ اپنے کیچڑ سے پٹے آنگن کو صاف اور ستھرا اور پھر سے مہمان نواز بنانا کوئی محنت کی بات ہی نہ تھی۔

(۱۱)

کسی کو اندازہ نہ تھا اب کے کوٹلے پہ اتنا جاتری پڑے گا۔ کسی کو گمان بھی نہ تھا اب کے سامنے پہاڑوں پہ وقت سے پہلے برف پڑ جائے گی اور امبادیوی سب بھگتوں کو کوٹلے کی طرف بھیج دے گی۔ اور پسرور، گوجرانوالہ، سمبڑیال، سیالکوٹ، سترلہ اور ستوہ کی سے سواریاں آئیں گی لاریوں اور بسوں پر، تانگوں اور اکوں پر، بیل گاڑیوں اور چھتناریوں پر......
کسی کو معلوم نہ تھا کوٹلے گانو کے لوگوں کے گھر دولت سے بھر جائیں گے اور ان پر ہن برسنے لگے گا۔ دیوانے شاہ کا سودا بک جائے گا اور جاٹ کا گھی، خیرے کا تیل اور جہلم کی بزری...... کبوتر مندر کے کلس سے گانو کی گلیوں میں اتر آئیں گے اور دانہ کھائیں گے اور ان کے پیار کی گھوں گھوں، چوبیس گھنٹے چلنے والی آٹے کی مشین کی کو کو میں گم ہو جائے گی...... اور برات گھر، دھرم شالہ اور ذیلداروں کی حویلی میں تل رکھنے کی جگہ نہ ہو گی اور لوگ دس دس، بیس بیس روپے ایک ایک کوٹھری کے دیں گے...... سنار کی بالیاں، ٹھٹھیار کی تھالیاں، چراغ کے چوڑے، کمہار کے کوزے، سب بک جائیں گے اور بڑ پہ پتہ رہے گا نہ محراب پر شہد کا چھتہ...... اور ابھی لوگ آ رہے تھے...... ناچتے اور گاتے، دف کوٹتے، نفیری بجاتے......"بجانا ہے تو بجا لو، امبا جی! اپاپیوں کے بجانے کی یہی بیلا ہے......؟

کوئی نہ جانتا تھا سال کے اس حصے میں کوٹلے کی عورتیں کیوں اوپر سے سوکھشم اور نیچے سے استھول ہو جاتی ہیں؟ کوئی کہتا اس کی وجہ پچھلی گرمی ہے، کوئی آنے والی سردی

......اور پھر وہ ہنسنے لگتے۔ گانو کی گچ گانھیاں ہاتھوں میں تھالی، تھالی میں صد برگ، صد برگ میں سیندور لیے مندر کی طرف چل نکلتیں اور اپنی ہی چال میں مست کہیں ایک کوٹھے پر تھم جاتیں تو گیان چند اور کیسر سنگھ رلدو اور دیوانے کی نبضیں چھوٹ جاتیں۔ ان کے جاتے ہی وہ ہوش میں آجاتے اور یک زبان ہو کر چلا اٹھتے .... "ہوئے ہوئے!"......

آج ہی بڑی پر کرما کا دن تھا۔ حضور سنگھ اور جنداں تک باہر گئے تھے لیکن رانو گھر ہی میں بیٹھی تھی۔ اس کے کارن بڑی بھی نہ گئی تھی .... جوان جہان لڑکی اور اس پہ پرکرما کے لیے آئے ہوئے ہزاروں البیلے، اس کی ایک انگلی بھی کسی کے حصے میں نہ آتی .... شلا پہ کوئی لال لال چیز پیس کر رانو اسے انگلی سے سمیٹتی ہوئی ایک کٹوری میں رکھ رہی تھی۔ گھلے ہوئے بیسن میں ہری مرچ کی دم نظر آتی تھی اور آلو کے قتلے اور چولھے پہ کڑاہی چڑھی تھی جس میں سرسوں کا تیل اُبل رہا تھا............

جب ہی چنوں کالے صوف کا سوٹ پہنے، گلے میں گلابی دوپٹہ اڑاتی ہوئی اندر آئی کالی قمیص میں سے اس کا گورا گورا سینہ، محبت اور کینہ لیے زندگی کا سیاہ و سفید سمجھا رہا تھا۔ رانو کو چوکے اور صحن میں یوں تھم گڑی دیکھ کر چنوں بولی۔

"ہائے ہائے نی خصم کھانیے .... آج کے دن تو گھر مری ہے؟"

رانی نے یونہی سا سر ہلا دیا۔

چنوں اور پاس آتے ہوئے بولی "باہر سب مخولیں! کھڑی تیری جان کو رو رہی ہیں اور تو یہاں کیا کر رہی ہے؟"

اور چنوں کی نظر رانو کی گلبرے کی شلوار پر جا پڑی "یہ بات!" چنوں نے اسے چھوتے، سر ہلاتے ہوئے کہا۔ رانو نے چنوں سے جان چھڑانے کے لیے کڑاہی میں پونی ڈال دی۔ ہاتھ اوپر اٹھے تو چنوں کو رانو کے کرتے کے اندر کچھ اور ہی گول سڈول، کچھ

مخروطی سا نظر آیا۔ اس نے بڑھ کر اوپر ہی سے کرتے میں ہاتھ ڈال دیا اور پھر فوراً ہی باہر نکال کر جھٹکنے لگی............ "ہائے مر گئی!" وہ بولی، جیسے جلتے ہوئے کوئلے چھو لیے ہوں "مالم ہوتا ہے منگل تیرے ساتھ سیدھا ہو گیا!"

رانو کچھ نہ بولی۔ دوسرے ہاتھ سے شلاپہ پسی ہوئی لال ہری چیز کے چٹخارے لینے لگی۔

"یہ کیا؟" چنوں نے پوچھا۔

اور پھر اس نے غور سے دیکھا۔ کھٹ مٹھی چٹنی تھی۔ چنوں کی آنکھیں چوڑی ہو گئیں۔ ایک انگلی سے اس نے بھی چٹنی کو منہ میں ڈال لیا اور سی سی کرتی آگے بڑھتی رانو کو شانوں سے جھنجھوڑتی ہوئی بولی.......... "ہائے ہائے نی۔ رنڈیے......؟......"

رانو، اونہوں، آنہاں کرتی ہوئی پیچھا چھڑانے لگی۔

"سچ بتا" چنوں بولی "نہیں تو میرا مری کا منہ دیکھے........... بتا، تجھے میری سوگندھ.........

رانو نے کچھ گھور گھار کے بڑی کی طرف اشارہ کیا جو پکی نشانی تھی۔ پھر چنوں کے کان کے پاس منہ کرتے ہوئے بولی "ہاہو[1]"

چنوں ایک دم تھرک اٹھی۔ ایک ہاتھ کولھے پر، دوسرا سر پر رکھے، وہ اپنے محور کے گرد گھوم گئی اور پھر ایکا ایکی باہر کی طرف لپکی.......... چلاتی، پکارتی ہوئی...... نی سردیو نی چاچی پورو! دو تونی.......... اڑیے کہاں مر گئیں ساری کی ساری..........؟

جتنی تیزی سے چنوں باہر نکلی اتنی ہی تیزی سے منگل اندر آیا۔ دروازے میں دونوں کی ٹکر ہو گئی۔ چنوں دیوار کے ساتھ جا ٹکرائی۔ منگل کی پگڑی پرے جا گری اور جوڑا کھل گیا۔ اسے یوں دیکھ کر چنوں کچھ ہنستے، کچھ خفا ہوتے ہوئے بولی۔

---

[1] ہاں

"اندھا!...... دکھائی نہیں دیتا۔ پورا کوڑھی! دھرت[1] راشٹوں[2] کا ہے۔"

"پر چنوں"! منگل نے پگڑی اٹھا کر بات شروع ہی کی تھی کہ چنوں بھاگ گئی۔ منگل نے جوڑا لپیٹتے، پگڑی پر سے گرد جھاڑتے ہوئے آواز دی......... "رانو!"

رانو سامنے ہی بیٹھی تھی لیکن چونک پڑی۔ آج منگل نے پہلی بار اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔ وہ رانی بھی کہہ سکتا تھا لیکن رانو"......... ضرور کوئی بات تھی۔......... رانو نے منگل کی طرف دیکھا جو اس کے پاس آ کر اکڑوں بیٹھ گیا تھا جیسے کوئی بڑے راز کی بات کہنا چاہتا ہو۔

سن رانو، کمال ہو گیا......... حد ہو گئی........."

رانو اندر ہی اندر مسکرا رہی تھی، بولی "پہلے تم کہہ لو، پھر مجھے بھی تم سے کچھ کہنا ہے۔"

"کیا کہنا ہے؟"

"پہلے تم کہہ لو"

منگل کہنے ہی والا تھا کہ اس کی نگاہ بڑی پر جا پڑی جو دیوار کے پاس کھڑی تھی اور جس کی نگاہ باہر کی طرف تھی اور کان ماں باپ کی طرف۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے منگل بڑے پیار سے بولا......... "جا بٹیا! تو اندر جا"

بڑی، چھوٹی سی ہو کر اندر چلی گئی۔ منگل بولا......... "جاتریوں میں ایک لڑکا آیا ہے، پچیس چھبیس برس کا......... گھبرو، جوان...... ڈسکے کے متصدی کا بیٹا......... زمینیں، مکان، دکانیں، جائداد........."

رانی کے چہرے کی چمک ماند پڑ گئی اور وہ کہہ اٹھی "تب تو وہ.........؟"

"ارے تو سن تو" منگل بولا......... "وہ کہتا ہے میں شادی کروں گا تو بڑی

---

[1] خاندان [2] دھرت راشٹر، کوروں اور پانڈوں کا جد امجد جو اندھا تھا

سے، دنیا کی کسی اور لڑکی سے نہیں؟"

"نہیں" رانو نے ایک دم سب کام چھوڑ دیا......... اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"تیری قسم" منگل نے کہا......... اور اس نے آج پہلی بار رانو کی قسم کھائی تھی۔ رانی کی سانس تیز ہونے لگی۔ گلبرے میں اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

"اس نے بڑی کو دیکھا ہے؟"

"ضرور دیکھا ہو گا......... شاید نہ بھی دیکھا ہو۔"

"نہ دیکھا......... نہ ملا، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیا معلوم؟" منگل بولا۔ "گانو کے پنچ بھی یہی چاہتے ہیں......... اور تو تو جانتی ہے پنچوں میں پرمشیر ہوتا ہے۔"

"ہاں" رانی مان گئی "پنچوں میں پرمشیر نہ ہوتا تو میں آج کہاں ہوتی؟"

کچھ شرماتے ہوئے منگل جاری ہوا......... "وہ سب کہتے ہیں، تیری بیٹی راج کرے گی، رانی بنے گی......... مطلب، تم ایسی رانی نہیں، وہ......... وہ جو اصلی ہوتی ہے........."

یہ سب کچھ رانی کے لیے ناقابل برداشت ہو رہا تھا لیکن منگل کہے جا رہا تھا "وہ کچھ لینے دینے میں بھی نہیں۔ اُلٹا سختی سے انکار کرتا ہے۔" اور پھر ایکا ایکی کسی خیال کے آنے سے وہ کہہ اٹھا۔ "اس کا یہ مطلب نہیں، میں کچھ دوں گا نہیں۔ مجھ سے جو ہو گا، دوں گا اپنی بیٹی کو......... پیچھے تھوڑی رکھ لوں گا۔"

"اپنی بیٹی" رانو کے کانوں کو یقین نہ آ رہا تھا۔

"میں تو اس کے لیے بک جاؤں گا، رانو" منگل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "چاہے اس کے لیے مجھے اکور کی کیوں نہ بیچنے پڑیں........."

جب ہی منگل کو کچھ یاد آیا.........."تم کچھ کہہ رہی تھیں..........؟......"

"کچھ نہیں" رانو بولی "سرمادائی کو بلوا دو.......... مجھے ابھی سے اس کے ساتھ بات پکی کرنی ہے۔"

"سرمادائی؟" منگل نے دہرایا اور پھر آنکھیں پھیلاتے ہوئے رانی کی طرف دیکھنے لگا اور بولا "سچ؟"

رانی نے خفیف سا سر ہلایا اور مسکراتے، شرماتے ہوئے پرے دیکھنے لگی۔

اسی دم چنوں، چاچی، پورو، بھابی، ودیا، جانکی سرو پو، چھوٹی رانی، چنڈی عورتوں کا ایک غول کا غول اندر چلا آیا، تالیاں بجاتا، شور مچاتا، ناچتا گاتا ہوا

چوڑے والی بانہہ کڈھ کے

منڈا موہ لیا تو تیاں والا

چوڑے والی بانہہ دکھا کر تعویذوں والا لڑکا موہ لیا!

دمڑی داسک مل کے

منڈا موہ لیا۔ تو تیاں والا

دمڑی کی چھال ہونٹوں پہ مل کر تعویذوں والا لڑکا موہ لیا......!......!!

منگل نے انھیں چپ کرانے کے لیے ہاتھ اوپر کیا۔ "چنوں...... چاچی!"

پورن دئی نے آگے بڑھ کر زور سے منگل کو ایک دھکا دیا اور بولی.........."جارے جا، بڑا آیا ہے۔"

"نیگر پڑا[1]" چنوں نے بھی دھکا دیا۔

"دفان ہو جا" ودیا بولی "تیرا یہاں عورتوں میں کیا کام؟"

بے حیا پورو بولی.........."تیرا جو کام تھا تو نے کر دیا.......... اب جا کا چلا۔" اور

---

[1] دولہا

پھر رانو کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "لڑکا پیدا کرناری.......... ایک اور مصیبت نہ کھڑی کر لینا۔"

اور بھی عورتیں اندر آنے اور منگل کو دھکے دے دے کر باہر نکالنے لگیں۔ رانو منگل کو بچاتے ہوئے رو بھی رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی.......... "ہائے ہائے نی رنڈیو!.......... ہائے نی میرا مرد.......... نی بس کرو، ہائے...... مار ہی ڈالو گی..........؟ اور منگل سر کو بازوؤں میں دے کر اپنی عزت بچاتا ہوا، لحہ بہ لحہ دروازے کے قریب ہوتا جا رہا تھا اور چلا رہا تھا...... "چاچی.......... چنوں! جاتا ہوں، میں جاتا ہوں.......... میری توبہ میرے باپ کی توبہ".......... اور وہ گرتا پڑتا، پگڑی سنبھالتا ہوا باہر نکل گیا۔

اب میدان عورتوں کے ہاتھ تھا۔ وہ رانی کی طرف بانہیں اُلار اُلار کے گا رہی تھیں.......... ناچ رہی تھیں۔

پودینے کی کرو کڑا ہی رے
ہمارا اچھا کرارا پودینہ ...... ہو!
مسالوں والا پودینہ ...... ہو!

اور وہ پاگل ہو رہی تھیں۔ ان کے گانے اور ناچ کی رفتار تھی کہ کم ہونے کی بجائے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ان کے شور میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ اس پر بھی رانو نے پورو کو پرے لے جا کر کہہ ہی دیا۔

"بدھائی ہو چاچی۔"

"بدھائی کس بات کی؟" پورن دئی نے اپنی ڈھیلی ہوتی ہوئی دھوتی کو کستے ہوئے کہا

"بڑی کے لیے بر مل گیا۔!"

بڑی جو دروازے میں کھڑی تھی، مرچ کی طرح لال ہو کر اندر سٹک گئی اور عورتیں جن کی نظروں کے افق پر ہمیشہ دولھے رہتے ہیں اور نیچے دلھنیں۔ جن کے کان

شہنائی کی آواز سننے کے لیے شہوانی، آنکھیں براتیں دیکھنے کی متمنی ہوتی ہیں، ایک دم بے خود اور پاگل ہو اٹھیں۔ ابھی سے انھیں بڑی کی برات دکھائی دینے لگی، باجے کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ انھوں نے تو یہ بھی نہ پوچھا............ لڑکا کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا کام کرتا ہے انھیں تو زرتار سہرے لگائے، سر پر کلغی سجائے، ہاتھ میں تلوار لیے، گھوڑی چڑھا ہوا دولہا نظر آرہا تھا اور ساتھ جانوروں، بندروں اور سوروں کی برات، جو پھٹے پرانوں میں سے ان کا جوبن لوٹے جا رہی تھی۔ اب وہ گا رہی تھیں۔

واڑ تھلّے دو نمبو پکّے
جیٹھ منگّے اُدھار ے

............باڑ کے نیچے دو نمبو پکے ہیں، جیٹھ اُدھار مانگ رہا ہے!

نہ میں جیٹھا مُلّے دیندی
نہ دیندی رکھوا رے

ڈنڈیاں نوں دل پے گیا............ جھمکے لین ہُلارے

اے جیٹھ! نہ میں مول دیتی ہوں، نہ رکھنے کے لیے............
نازک ڈالیوں کو بل پڑ گیا ہے اور جھمکے جھولنے لگے ہیں۔

ایک اور نے شروع کیا............

سوہریا بدام رنگیا!
نونہاں گوریاں، پُتر تیرے کالے............

اے بادام کے رنگ والے سسر! تیری بہوئیں گوری ہیں (لیکن) بیٹے کالے............ وہ اپنے تصور میں دنیا بھر کی دلھنوں کو ان کی سسرال پہنچا چکی تھیں۔

اس شور کی وجہ سے، دیوی ماں کے درشنوں کے لیے آئی ہوئی پوری پرکرما، منگل کے گھر کی طرف پلٹ پڑی، جیسے دیوی ماں مندر میں نہیں وہاں ہے یا جیسے مندر وہاں چلا آیا

ہے جہاں خلقت ہے۔ گیان چند سرپنچ، تارا سنگھ، نمبردار کیسر سنگھ، جگو، رلدو، دیوانا، کرمو، دُلا، جمالا سب آکر کھڑے ہو گئے .... کوٹھے پر عورتوں کے ٹھٹ نظر آنے لگے، نیچے مردوں کے .... اڑوس پڑوس اور باہر گانو کے لوگوں کے علاوہ سرمادائی بھی آئی تھی جو ساری دنیا کو دنیا میں لائی تھی اور اب اوروں کو بھی لانا چاہتی تھی۔

جہلم کی تینوں بیٹیاں .... عنایتی، عائشہ اور سلامتی بھی چلی آئیں۔ ساتھ جہلم کے بڑے بھائی کا لڑکا بھی تھا .... مولو! جس کے بے خود، بے بس اشاروں کی طرف دیکھ کر سلامتی شرما رہی تھی، بر مار ہی تھی۔ پھر نواب کی بیوی عائشہ گورداس کی گن وتی .... سب اگلی پچھلی کدورتیں بھول کر اس لمحے میں کھو کھو گئیں ......

پورو اور وِدّیا نے رانی کو بھی بیچ میں گھسیٹ لیا .... ان سب کے درمیان ڈبوّ پاگل ہوا گھوم رہا تھا۔ اِسے اُسے سب کو سونگھ رہا تھا، بے تحاشا دم ہلا رہا تھا ...... رانو کچھ احتیاط اور کچھ بے احتیاطی سے ناچ رہی تھی۔ اس کے گلبرے کی شلوار .... معلوم ہوتا تھا کوڑیالے رنگ کا کوئی سانپ ہے جو لپٹا بل کھاتا ہوا اوپر ہی اوپر جا رہا ہے .... رانو جس کا مصیبت میں دبا ہوا حسن آج تک کسی نے نہ دیکھا تھا، پھانٹوں والے کرتے کے بیچ سے آنکھیں مارے چندھیانے، خیرہ کرنے لگا، جیسے کوئی شیطان بچہ ہاتھ میں آئینہ لیے آتے جاتوں پر سورج کی روشنی کا عکس لپکائے، ان کی آنکھیں چندھیائے، بار بار اندھا کیے جائے۔

ناچتی ہوئی عورتوں کی نگاہوں میں دنیا ایک وسیع و عریض دائرہ بن گئی۔ جس کے بیچ مرد، عورتیں، بچے بوڑھے صرف خاکے تھے۔ پھر وہ بھی رنگ کے بڑے بڑے چھینٹوں اور دھبّوں میں بدل گئے .... اور آخر ایک ہی رنگ رہ گیا .... سورج کی کرنوں کا رنگ جس میں سب ہی رنگ چھپے رہتے ہیں اور الگ الگ پہچانے جانے کے لیے انسان کی دماغی منشور کے محتاج و منتظر۔

باہر کچھ اور ہی شور مچا اور یہ غول کا غول، جھرمٹ کا جھرمٹ گئی نئے رنگ پیدا کرتا ایک دوسرے پر گرتا پڑتا دروازے پر، کوٹھوں کی منڈیروں پر کنویں کے من پر پہنچ گیا۔

.... یہ جاتری لوگ تھے جو سر جھکائے دیوی کی بھینٹیں گاتے ہوئے آرہے تھے ،ڈھولک، پیٹے چھینے بجاتے ہوئے دیوی ماں کی استتی گا رہے تھے۔ وہ سب کے سب اپنے اپنے گناہوں کا کفارہ کرنے چلے آئے تھے .... گناہ، جو ہو چکے تھے .... گناہ جو ہو رہے ہیں .... گناہ جو ہونے والے ہیں ....

وہ ناچ رہے تھے، گا رہے تھے۔

ماتا رانی دے دربار، جو تاں جگدیاں

میا رانی ....

ہے میا! تسیں سنتے بھدیاں گوریاں

ماتا رانی دے دربار، جو تاں جگدیاں

.... منظر کھلا اور سب نے دیکھا چودھری مہربان داس اور اس کا بھائی گھنشام سات سال کی قید کاٹ کر آرہے تھے، جاتریوں کے شور اور غوغے ان کو پڑتے ہوئے حال کے پس منظر میں ان کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی .... کمریں سجدوں سے دوہری اور کان توبہ اور شرم سے لال .... صدیوں کے خشوع اور خضوع کے بعد اب ان کے ہونٹوں پر چپ چلی آئی تھی اور ان کی یہ چپ داستانیں کہہ رہی تھی ....

اور ان سب کے بیچ ایک لڑکا تھا .... پچیس تیس برس کا ...... گبھرو ...... جوان ...... خوب صورت .... جو اس وقت بڑے آرام بڑے پیار، بڑی ہی محبت اور عقیدت سے دیوی ماں کی بھینٹیں گا رہا تھا .... اسے دیکھ دیکھ کر لوگ حیران ہو رہے

تھے۔ سب کے ہونٹوں پر ایک ہی سوال تھا۔ نگاہوں میں ایک تجسس............ اتنی چھوٹی عمر میں، اس لڑکے نے کون سا گناہ کیا تھا؟.......... شاید........... اس نے گناہ نہیں، گناہ نے اسے کیا تھا..........

جب ہی بھیڑ کو چیرتا، دھکے دیتا، دھکے کھاتا ہوا منگل رانی کے پاس چلا آیا اور اسے کندھے سے پکڑ کر، جھنجوڑتا ہوا بولا........... "رانو! وہ ہے.......... وہ ہے لڑکا۔" اور اس نے بھینٹیں گاتے ہوئے لڑکے کی طرف انگلی اٹھائی۔

رانو نے دور سے اس خوب صورت لڑکے کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہوں میں سو نمبر رچ گئے۔ من ہی من میں اس نے بڑی کی بانہوں کے ہار اس کے گلے میں پہنا دیے اور خود امر بیل بنی اس سے لپٹ لپٹ گئی...... اتنا جوان، اتنا سجیلا، گبھرو نہ ملا ہوگا کسی ماں کی بیٹی کو، محبت کے جوش میں دیوانی ہوتی ہوئی رانی نے پاس کھڑی چنوں کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور زور سے اسے بھینچے، اس کی چیں بلاتے ہوئے بولی

"ہائے نی چنوں.......... میں تو پار ہو گئی.........."

بڑی بھی عورتوں کے جھرمٹ میں سے سر نکال نکال کر لڑکے کو دیکھ رہی تھی آپا دھاپی کی اس بھیڑ نے سب کی شرموں کو چھپا لیا تھا، لہو پورے بدن سے کھنچ کر اس کے منہ کو آنے لگا تھا۔ وہی لہو سلامتی کے چہرے سے غائب ہو گیا اور وہ اپنی بڑی بہن سے کہنے لگی ......"آپاں، گھر چل.......... میں تو تھک گئی.........."

اور رانی بچوں کی طرح اِسے اُسے سب کو اپنا کھلونا دکھا رہی تھی.......... "دیکھا چاچی؟ وڈو تو بھی دیکھ.......... دیکھ چنڈیے، رنڈیے.......... لاجو.........."

پورو چاچی نے دیکھا، وڈیا نے جانچا، چنڈی نے تولا لاجو، جانکی، ککی.......... اور رانی سب کی طرف دیکھتی، سر جھٹکتی ہوئی بولی.......... "ہے نا؟"

جب ہی رانی کی نظروں کی کڑی ٹوٹ گئی۔ اس نے دیکھا چنوں کے چہرے کا رنگ

ایک دم زرد پڑ گیا تھا۔ اسی بے بہارے، توریے کے پھول کی طرح.......... رانی نے ایک تیز سی نظر اس پہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہائے نی؟" اور پھر اسی نظر سے لڑکے کی طرف دیکھنے لگی جواب تک قریب آ چکا تھا اور نظروں کی جھولیاں پھیلائے ہاتھ جوڑے رانی سے کوئی بھیک مانگ رہا تھا۔ رانی نے ایک دم سانس اوپر کھینچی.......... "میں مر گئی!"

سانس باہر آنے سے پہلے، رانی کے چہرے کی سرخی صاف اور سامنے پر لگا کر اڑتی ہوئی نظر آئی اور وہ روئی کی طرح سفید ہو گئی، پہلے ہاتھ کانپے اور پھر پورے کا پورا بدن تشنجی ہو گیا اور وہ لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "وہی.......... یہ تو وہی ہے جس نے میرے.........."

رانی اس ناگہانی صدمے سے بیہوش ہو کر گرنے ہی والی تھی کہ صدیوں کے سٹرگ سے سفید اور سرافگند، حضور سنگھ کہیں سے گرتا پڑتا چلا آیا اور قریب کھڑی جنداں بوڑی سے بے پروا ہو کر اس نے رانی کو گرنے سے تھام لیا۔ آج اس کی آنکھیں جوہڑ پہ نہانے والے کبوتروں کی طرح پھڑ پھڑانے کی بجائے پورے پر تول رہی تھیں۔ شاہین صفت بلند آشیانوں کی طرف اڑ رہی تھیں..........

"بہو۔" اس نے لرزتے کانپتے ہوئے ہونٹوں کے بیچ سے کہا "تو کیسے روتی ہے؟..... میری طرف دیکھ، جس نے بیٹا دیا ہے ہمیشہ بیٹا دیا ہے، جب کہیں جا کے ایک بیٹا پایا ہے۔"

اور پھر، بہو رانی کی روح کو پالینے کے جتن میں بڈھا حضور سنگھ خود کہیں کھو گیا۔ اس کی آنکھوں کی گنگا جمنا، اس کی داڑھی کے جنگل بیلوں میں گم ہو رہی تھیں۔ تلوکے کی موت کے بعد آج تک اس کے ہاتھ، کسی نہ ہاتھ آنے والی چیز کی تلاش میں کھپ گئے تھے.......... آواز گلے میں کانپتی رہ گئی تھی..........

نہیوں لبھنے لال گواچے

مٹی نہ پھرول جو گیا............

جوگی! بے کار کی خاک مت چھان۔ لال جو ایک بار کھو گئے سو کھو گئے۔ اب وہ تجھے نہیں ملیں گے، ہاں، لال کے بدلے تجھے لال مل جائیں گے، ہیرے مل جائیں گے موتی............ پنّے............ پر وہ لال؟............ نہیں............

جب ہی تو............ حضور سنگھ کی آنکھیں اس دنیا کے رشتوں اور بندھنوں میں کہیں رل گئی تھیں اور نظارے اس کی بے بسی پر رو رہے تھے۔ اب وہ خود نظارہ تھا اور خود ہی ناظر، آپ تماشا اور آپ ہی تماشائی............ اس کے سر پہ گیرو سے رنگ کی پگڑی بندھی تھی جس کے پیچ کھل کھل جاتے تھے۔ اس وقت پلّو سے وہ اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں اور ریک سی ناک پونچھتا ہوا کوئی جوگی، کوئی رمتا رام معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دنیا کو چھوڑ رہا تھا۔ پر دنیا اسے نہیں چھوڑ رہی تھی............ آج موت کے دروازے پہ کھڑے اسے کوئی دیھ درشٹی مل گئی تھی اور وہ دیکھنے لگا تھا............ جنم............ مرن............ اور بیچ میں ایک رانی بہو............ جو شادی کے روز، ایکا ایکی کہیں کتم عدم سے معرض وجود میں چلی آتی ہے اور پھنکاری کے پیچھے سے اپنی کلیروں سے آٹی، لال لال چوڑیوں سے پٹی، گوری گوری بانہیں نکالتی، چھنکاتی ہے............ مہندی کی خوشبو سے بوجھل ہاتھ جوڑتی، گھونگھٹ کی اوٹ سے، نیم نگاہی کی زبان میں منتیں کرتی اپنے سسر سے کہتی ہے پتا مہ! تو اپنا ایک یہ بیٹا دے دے مجھے۔ میں اس کے بدلے تجھے دس دوں گی۔ اسی کی شکل میں............ اسی کی عقل میں............ اور پتا مہ کہتا ہے............ ہاں ہاں بیٹی! پر یہ بیٹا میرا............؟ اور پھر وہ آنسو پونچھتا ہوا منہ پھیر لیتا ہے............

رانی کے لانبے لانبے کیش، حضور سنگھ کی انگلیوں سے اُمڈنے والی شفقت کے سیل میں نہا رہے تھے، چھینٹے اڑا رہے تھے۔ آج اسے اپنے کھوئے ہوئے باپ کی جگہ کوئی

آسمانی باپ مل گیا تھا۔ اسی لیے ہر قسم کے رکھ رکھاؤ سے بے نیاز، وہ بار بار اپنا سر اس کی چھاتی پر پٹخ رہی تھی اور کہہ رہی تھی.......... "نہیں.......... نہیں باپو، یہ نہ ہوگا.......... ہائے! میری بیٹی!.......... میں مر جاؤں گی، باپو..........

اس وقت پر کرما کے لیے آئی ہوئی ساری خلقت تھم چکی تھی اور رکے ہوئے سانسوں سے ایک عظیم فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا رانی ہاں کہے گی تو دنیا میں بس جائیں گی اور نہ کہے گی تو پرلے آجائے گی۔

مہا پرلے، جس میں کیا انسان اور کیا حیوان، کیا پشو اور کیا پنچھی، کیا دھرتی اور کیا آکاش، سب ناش ہو جائیں گے، سمے کے پاس کوئی نوح نہ رہے گا اور خدا کے پاس کوئی روح .... شبد میں جھنکار نہ رہے گی، جیوتی میں پرکاش نہ رہ گا.......... اور بیچ پر میشور سامنے کھڑے ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوئی دعائیں مانگ رہے تھے اور ان کی دعاؤں میں یہ سیدھا سادا، معصوم منگل بھی شامل ہو گیا تھا..........

جب ہی رانی کو دلاسا دیتے ہوئے حضور سنگھ بولا.......... "بیٹا! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟.......... کیوں ہو رہا ہے؟.......... اسے تو نہیں جانتی، نہ میں جانتا ہوں، نہ یہ لوگ جانتے ہیں.......... تو اسے سمجھنے کی کوشش بھی مت کر.......... ایک چپ، یہاں تو دم مارنے کی جگہ نہیں.........."

رانی نے مڑ کر دیکھا۔ بڑی کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں وہ کہہ رہی تھی.......... ماں! یہ تو کیا کر رہی ہے؟ تو نہ بولی تو میں بن بیائی دھرتی کی طرح بانجھ رہ جاؤں گی..........

رانی نے سسر کے کاندھے پر سے سر اٹھایا اور بولی "اچھا باپو!.......... اچھا۔"

ایک دم بھینٹیں شروع ہو گئیں۔ لوگ پورے جوش و خروش کے ساتھ گانے بجانے، شور مچانے لگے۔ جن کے بیچ رانی نے اوپر، مندر کی طرف دیکھا، سنہرے کلسوں سے دیوی کا طلائی تبسم منعکس ہو کر رانی کے چہرے پر پڑ رہا تھا اور اسے منور کر رہا تھا..........

تھوڑی ہی دیر میں رات ہو گئی اور اندھیرا چھا گیا۔ اس پہ بھی ایک تیز چکا چوند کر دینے والی روشنی تھی جو جھپک جھپک کر، لپک لپک کر رانی کی طرف آ رہی تھی اور جس نے پوری طرح سے اس کے بدن کا احاطہ کر لیا تھا............ اسی دم مندر میں گھنٹیوں کا غوغا مچا، مسجد سے اذان بلند ہوئی اور جہاں کلس تھے، وہاں اندھیرے میں کسی کے ہاتھ پھیلے اور گردن لٹکتی ہوئی نظر آئی۔

ایک ڈر تھا............ اور ایک حظ بھی، جس میں سنسناتی ہوئی رانو نے اپنے دونوں ہاتھ کلسوں کی طرف اٹھا دیے اور روتی دھوتی، لرزتی کانپتی ہوئی بولی۔

"ماں!.......... ہے دیوی ماں..........!!"

جب ہی وڈیا نے پورو کی کمر میں ٹہوکا دیا............ "اے پورو! سب ہی آئے، ایک تیرا دھرم داس نہیں آیا؟"

اور پورو جھوٹ موٹ روتی ہوئی، اپنے شبھو کے راہی باپ کا ماتم کرنے لگی۔

ادارے کی دیگر ادبی کُتب

	کتاب	مصنف	قیمت
-1	پریم چند کے 15 منتخب افسانے	انتخاب: شمیم حنفی	-/200 رُوپے
-2	چند ہم عصر	بابائے اُردو: مولوی عبدالحق	-/200 رُوپے
-3	انتخابِ کلام میر	بابائے اُردو: مولوی عبدالحق	-/200 رُوپے
-4	دیوان غالب (فرہنگ کے ساتھ)	مرزا اسداللہ خاں غالب	-/300 رُوپے
-5	دیوان میر تقی میر	میر تقی میر	-/100 رُوپے
-6	مراۃ العروس	ڈپٹی نذیر احمد	-/120 رُوپے
-7	باغ و بہار (فرہنگ کے ساتھ)	میر امن دہلوی	-/200 رُوپے
-8	فردوسِ بریں	عبدالحلیم شرر	-/120 رُوپے
-9	مسدس حالی (جدید ایڈیشن)	مولانا الطاف حسین حالی	-/160 رُوپے
-10	پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	-/80 رُوپے
-11	عروض سب کے لیے	کمال احمد صدیقی	-/250 رُوپے
-12	سرمایہ	کیفی اعظمی	-/300 رُوپے
-13	کوکھ جلی	راجندر سنگھ بیدی	-/200 رُوپے
-14	ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	-/200 رُوپے

SEVENth SKY PUBLICATION
Al-Hamd Market, Ghazni Street,
40- Urdu Bazar, Lahore.
Ph: 042-7223584, 0300-4125230